U100149 , Date- 18-12-09

Title - HINDUSTANI LISANIYAAT KA KHAKA.

Creator - John Howes; Mutarjuma Sayyed Ahtisham Hussain.

Publisher - Danish Mahal (Lucknow).

Date - 1957.

Pages - 148

Subject - Linguistics.

ہندستانی لسانیات کا خاکہ

سید احتشام حسین

دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

ہندستانی لسانیات کا خاکہ

از

جان بیمز

ترجمہ معہ حواشی و مقدمہ

از

سید احتشام حسین
لکھنؤ یونیورسٹی

ناشر : دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ

طابع : سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت : [illegible] مجلد [illegible] روپے [illegible]

بار اوّل ــــ مارچ سنہ ۴۸ء

بارِ دوم ــــ نومبر سنہ ۵۷ء

مؤلف کی دوسری کتابیں

۱۔ تنقیدی جائزے ــــ سنہ ۴۴ء و سنہ ۴۹ء

۲۔ روایت اور بغاوت ــــ سنہ ۴۶ء و سنہ ۵۶ء

۳۔ ادب اور سماج ــــ سنہ ۴۸ء

۴۔ تنقید اور عملی تنقید ــــ سنہ ۵۲ء

۵۔ ویرانے (افسانے) ــــ سنہ ۴۲ء و سنہ ۵۴ء

۶۔ ساحل اور سمندر (سفرنامہ) ــــ سنہ ۵۴ء

۷۔ اردو ساہتیہ کا اتہاس (ہندی) ــــ سنہ ۵۴ء

۸۔ ذوقِ ادب اور شعور ــــ سنہ ۵۵ء

۹۔ اردو کی کہانی ــــ سنہ ۵۶ء

علہ مہاتما کہنا غلط ہے اس لیے کہ اس کا معنی روح القدس کے آتے ہیں جو کہ خاص لقب ہے حضرت جبریل امین کا اس لیے گاندھی جیسے ناپاک آدمی کو روح القدس (مہاتما) کہنا سراسر غلط ہے

مہاتما گاندھی

کی یادمیں

جنھوں نے ہندوستان کی لسانی
گتھی کو سلجھانے کی سب سے زیادہ
پرخلوص کوشش کی

احتشام

۱۲ فروری ۱۹۴۸ء

فہرست

دیباچۂ مترجم

(طبع اوّل)

ہندستانی لسانیات پر مختصر کتابوں میں جان بیمز کی کتاب ہندستانی لسانیات کا خاکہ (این آوٹ لائن آف انڈین فیلالوجی) ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں ارتقائے لسان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو دوسری کتابوں میں اتنے واضح انداز میں نہیں ملتے مثلاً زبان کی قسمیں یا ان کے ارتقائی مدارج کی بحث، زبانوں کی خصوصیات، بولی اور زبان کا فرق خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اس وقت اُردو، ہندی اور ہندستانی کی جو گتھی ہمارے لئے حوصلہ شکن بن رہی ہے اس کے حل کرنے میں قومی جذبات سے زیادہ لسانیات کا مطالعہ مدد دے سکتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس کا ترجمہ پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ لسانیات کی کتابوں اور خود بیمز کی کتابوں میں اس مختصر خاکے کو کوئی عظیم الشان کارنامہ نہیں کہا جا سکتا، اس کا اعتراف بیمز نے دیباچے میں کیا ہے۔ (جس کا ترجمہ غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا گیا) تاہم اُردو پڑھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ صرف علم ہی میں اضافہ کا باعث نہ ہوگا بلکہ اپنی زبان کے صحیح قواعد مرتب کرنے اور اس کے ارتقا کے صحیح راستے سے واقفیت حاصل کرنے میں بھی معین ہوگا۔

جان بیمز غدر کے بعد بہار اور بنگال میں کلکٹر اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے مختلف اضلاع میں رہا اور ہندستان کے مختلف حصوں میں گھوما پھرا، بچپن ہی سے اسے

زبانوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ ہندوستان میں زبانوں اور بولیوں کی کثرت نے اس کے ذوقِ تحقیق کو ابھارا اور اس نے یہاں کی متعدد زبانوں کا مطالعہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ میں بھی لسانیات پر زور و شور سے کام ہو رہا تھا۔ چنانچہ بیمز نے اس سلسلہ میں کئی کتابیں لکھیں۔ غالباً اس کی پہلی کتاب یہی ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۶۶ء میں لکھی گئی اور کلکتہ سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ بیمز اپنے علم و فضل کی وجہ سے نہ صرف بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا سرگرم ممبر تھا بلکہ لندن، پیرس اور برلن کی مختلف لسانی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ تھا۔ صحت کی خرابی، کام کی کثرت، سفر کی زیادتی کے باوجود اس نے لسانیات سا نازک کام اپنے ذمہ لیا اور ایک عالم کی طرح اسے تکمیل تک پہونچایا۔ بیمز اپنی عالمانہ کتاب جدید آریائی زبانوں کی تقابلی قواعد (اے کمپیریٹو گرامر آف ماڈرن ایرین لینگویجز) کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس نے یہ کتاب سنہ ۱۸۶۶ء میں شروع کی اور اس کی پہلی جلد سنہ ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی۔ دوسری اور تیسری جلدیں بعد میں نکلیں۔ اس میں سات جدید آریائی زبانوں سندھی، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی، اڑیہ اور ہندی کی قواعد کا تقابلی مطالعہ ہے۔ عام مطالعہ کرنے والوں کے لیے پہلی جلد کا مقدمہ بے حد اہم ہے جس سے میں نے خود فائدہ اٹھایا ہے اور اگر ممکن ہوا تو اس مقدمہ کا ترجمہ بھی پیش کروں گا۔ اس کے علاوہ بھوج پوری پر ایک مختصر سا رسالہ بھی بیمز نے لکھا۔ اس نے ماگا زبان کی ایک قواعد بھی مرتب کی جس کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں متعدد مضامین لکھنے کے علاوہ بیمز نے ایلیٹ کی کتاب صوبہ جات شمالی و مغربی کی تاریخ، قدیم گیت مالا اور نسلی تقسیم کے متعلق یادداشتوں کی دو جلدیں مرتب کیں۔

اب چند جملے ترجمے کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک اردو میں لسانیات پر

بہت کم لکھا گیا ہے۔ قواعد کی سائنٹفک کتابیں بھی نہیں ہیں اس لئے مجھے بعض اصطلاحات کے ترجمہ میں دشواریاں پیش آئیں اور کوشش کے باوجود مجھے یقین نہیں ہے کہ ہر جگہ میں نے مناسب لفظ استعمال کیے ہیں۔ کتاب اردو دانوں کے لیے عام فہم اور دلچسپ بنانے کے لیے میں نے مختصر حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ بعض جگہ مثالیں چھوڑ دی ہیں لیکن وہ مثالیں غیر ضروری تھیں بعض جگہ وضاحت کے لیے کچھ جملے بڑھا دیے ہیں اور انھیں قوسین میں لکھ دیا ہے جہاں مجھے اختلاف تھا اس کی طرف بھی میں نے اشارہ کر دیا ہے یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں نے ایک مقدمہ لکھنا ضروری سمجھا۔ یہ مقدمہ طویل ہو گیا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے کتاب کی افادیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس مقدمہ میں اصل مباحث کی جانب صرف اشارے کیے گئے ہیں اور تفصیلات سے قطع نظر کر کے صرف نتائج پیش کیے گئے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ جلد ہی فلسفہ لسان اور اردو پر ایک مختصر سی کتاب پیش کر دوں اس میں اس اجمال کی تفصیل ہو گی۔ چونکہ بیمز نے ہندی اردو کے متعلق اس کتاب میں بہت کم لکھا تھا اس لیے میں نے اس کے بعض خیالات اس کی دوسری تصانیف سے لے کر مقدمہ میں شامل کر دیے ہیں تاکہ بیمز کا صحیح نقطۂ نظر سامنے آجائے۔

جب میں نے اس کتاب کا ترجمہ شروع کیا تو یہ بات میرے علم میں نہ تھی کہ اس کا دوسرا اڈیشن بھی شایع ہو چکا ہے لیکن جب میں ترجمہ مکمل کر چکا تو مجھے اس کا دوسرا اڈیشن ملا جو ۱۸۶۸ء میں لندن سے شایع ہوا تھا اور اس میں بیمز نے نہ صرف پہلے اڈیشن کی بعض اہم غلطیاں درست کی تھیں بلکہ بہت کچھ اضافہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ میں نے ان اضافوں کو اس میں شامل کر لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پہلے اڈیشن کے چند پیراگراف جو بیمز نے چھوڑ دیے تھے میں نے انھیں بھی باقی رکھا ہے۔ اس طرح میرا یہ ترجمہ دونوں اڈیشنوں کا مجموعہ ہے۔ دوسرے اڈیشن میں بعض ضمیموں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے میں نے ضمیموں کے کچھ خلاصے دیے ہیں۔ پورے ضمیمے ترجم

کو بڑھاتے تھے۔ کتاب کے آخر میں ایک نقشہ بھی تھا وہ مجھے کہیں سے نہ مل سکا میں نے پڑھنے والوں کی آسانی کے لیے موجودہ حالات کے پیش نظر ایک نقشہ بنا دیا ہے۔

میں محبی نسیم احمد صاحب مالک دانش محل لکھنؤ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ایسے وقت میں اس کتاب کے شایع کرنے کی ہمت کی ہے جب اُردو کی کتابوں اور خاص کر ٹھوس علمی کتابوں کے لیے بازار سرد ہو رہا ہے لیکن نسیم صاحب صرف کتابوں کے تاجر نہیں ہیں بلکہ اردو زبان و ادب کا ذوق اور خدمت کا شوق بھی رکھتے ہیں۔

لکھنؤ ۱۵ ر فروری ۴۸ء ـ سید احتشام حسین

دیباچہ طبع دوم

جب پہلی دفعہ یہ کتاب شایع ہوئی تھی تو میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اسانیات پر ایک کتاب جلد ہی مرتب کروں گا لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ ارادہ اب بھی قائم اور نیت اب بھی بخیر ہے بلکہ اس سلسلہ میں بہت سا کام ہو بھی چکا ہے لیکن چونکہ اس کتاب کی ضرورت اب بھی لوگوں کو محسوس ہوتی ہے اس لیے اس کا دوسرا اڈیشن شایع کیا جا رہا ہے معمولی لفظی تبدیلیوں کے علاوہ مقدمہ میں کچھ ضروری ردّ و بدل بھی ہوا ہے۔ پڑھنے والوں کی توجہ خاص طور سے مقدمہ کے آخری حصہ کی جانب مبذول کرانا ہے کیونکہ حالات بدل جانے کی وجہ سے یہاں سب سے زیادہ تغیرات ہوئے ہیں اور پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ خیالات میں بھی کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ اُردو زبان کے مستقبل کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ اُس وقت ممکن تھا نہ اس وقت ممکن ہے تاہم غور و فکر کے لئے کچھ مواد یکجا کر دیا گیا ہے۔

لکھنؤ یونی ورسٹی
۱۵ ر اگست ۱۹۵۷ء

سید احتشام حسین

مقدمہ

لسانیات نسبتاً ایک جدید علم ہے، دوسرے علوم کے مقابلہ میں بھی اس کے جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہے، ویسے تو ہر شخص اپنی زبان کے صحیح غلط ہونے کا تھوڑا بہت اندازہ رکھتا ہے لیکن علمی حیثیت سے زبان کی پیدائش، اس کے ارتقا الفاظ کی ساخت، اجزائے کلام کی ابتدا اور تبدیلیوں کے متعلق بہت کم لوگوں کو علم ہوتا ہے۔ ہندوستانی اور یونانی علما نے مسیح کی پیدائش کے قبل اپنی زبان کی ساخت پر غور کیا تھا لیکن ارتقائے لسان کے اصول یا تقابلی لسانیات کو ہاتھ نہیں لگایا تھا زبردست علمی ترقی کے باوجود یورپ نے اٹھارویں صدی کے نصف تک زبان کے سائنٹفک مطالعہ کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔ سرسری طور پر بعض زبانوں کی مماثلت اور مشابہت پر غور کر لیا جاتا تھا لیکن جب ہندوستان یورپین اقوام کی حوصلہ مندیوں کی جولاں گاہ بنا تو یہاں کے علوم و فنون اور زبان و ادب کے متعلق انھیں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ عیسائی مشنریوں کی معمولی کوششوں کے بعد سب سے پہلی انقلابی کوشش سر ولیم جونس نے کی جس سے تقابلی لسانیات کی بنیاد یورپ میں پڑ گئی اور تھوڑی ہی مدت میں بہت سے مستشرقین پیدا ہو گئے جنھوں نے سنسکرت، یونانی، لاطینی اور قدیم جرمن زبانوں کا تقابلی مطالعہ کر کے لسانیات کو

ایک زبردست علم بنا دیا جس کا رشتہ حیات، طبیعیات، تاریخ، علم الآثار، جغرافیہ اور نفسیات وغیرہ سے قائم ہو گیا اور انھیں کی طرح اسے اہمیت حاصل ہو گئی۔ ولیم جونس جو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بنگال میں عدالت عالیہ کے جج کے عہدے پر فائز تھا، سنسکرت کا گہرا مطالعہ کر کے ۱۷۸۶ء میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی تینوں زبانوں کا ماخذ ایک ہے اور سنسکرت اس ماخذ سے سب سے زیادہ قریب ہے یہی نہیں بلکہ اس نے گاتھک (قدیم جرمن) اور کلٹک (قدیم آئرستانی) زبانوں کے بھی اسی مشترک ماخذ سے متعلق ہونے کا خیال ظاہر کیا اس سے قبل بھی زبانوں کا مطالعہ ہو رہا تھا لیکن اس انقلابی انکشاف نے شلیگل[۱]، بوپ[۲]، گرم[۳] وغیرہ کو جنم دیا جنھوں نے زبانوں سے متعلق حقائق اور معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ جمع کر کے بعض اہم نتائج نکالے اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ جدید تحقیقات سے ان نتائج میں ترمیمیں ہو گئی ہیں لیکن اس سے اُن عالموں کے کاموں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

ابتداءً زیادہ توجہ قدیم زبانوں ہی پر کی گئی۔ ہندستان کی زبانوں میں صرف سنسکرت کا مطالعہ ہوا، خود ہندستان کے قواعد نویسوں نے بہت دنوں تک پراکرتوں کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا لیکن ابھی اٹھارویں صدی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ یوروپین علم دوستوں نے ہندستان کی جدید بولیوں کا مطالعہ شروع کر دیا چنانچہ ان کام کرنے والوں کی ایک فہرست سر جارج گریرسن نے اپنے "ہندستان کے

---

[۱] فریڈرش فان شلیگل (۱۷۷۲ء سے ۱۸۲۹ء تک) جرمن کا مشہور سنسکرت عالم اس نے تقابلی قواعد پر زبردست کام کیا۔
[۲] فرینز بوپ (۱۷۹۱ء سے ۱۸۶۷ء تک) یہ بھی جرمن عالم تھا تقابلی لسانیات اس کا خاص موضوع تھا۔
[۳] جیکب گرم (۱۷۸۵ء سے ۱۸۶۳ء تک) یہ بھی جرمن عالم تھا اس کا نام "قانون تغیر اصوات" معلوم کرنے کے سلسلے میں بہت مشہور ہے حالانکہ اس نے قدیم جرمن ادب پر بھی بہت کام کیا ہے۔

لسانیاتی جائزے[1]" کی تمہیدی جلد میں دی ہے۔ پہلے قواعد اور لغات کی کتابیں مرتب کی گئیں جن کا مقصد اتنا علمی خدمت نہ تھا جتنا نو وارد انگریزوں کو ہندستان کی عام زبانوں (اردو و ہندی) سے آشنا کرانا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد زبان کے تقابلی اور عالمانہ مطالعہ کا دور آیا اور ہندستان کی جدید آریائی زبانوں کے متعلق تحقیقی کام ہونے لگا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بیمز[2] اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ اب کچھ ہندستانی ماہرین لسانیات بھی ملکی زبانوں سے دلچسپی لے رہے ہیں۔

بیمز اور ہندستانی لسانیات

ہندستان زبانوں اور بولیوں کا عجائب خانہ کہا جاتا ہے اور پھر یہ بھی نہیں ہے کہ تمام زبانیں اور بولیاں کسی ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہوں بلکہ کئی خاندان ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ مختلف خطے الگ الگ لسانی حلقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور تاریخ کے بعض ایسے ادوار سے گذرے ہیں جن کی تاریخ بھی واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں ہے۔ بعض زبانوں کے ایسے تحریری نمونے بھی موجود نہیں ہیں جن کی مدد سے اُن کے ارتقا کی تاریخ مرتب کی جا سکے۔ اس وجہ سے کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس وسیع ملک کی تمام زبانوں اور بولیوں کے نازک انفرادیات کو قلم بند کر سکے۔ جدید ماہرین لسانیات نے اہم بولیوں اور زبانوں کے ساتھ ساتھ غیر اہم زبانوں پر بھی کام کیا ہے۔ پھر بھی بہت سے مسائل ابھی تک قطعی طور پر حل نہیں ہوئے ہیں۔ بیمز نے اہم زبانوں کی طرف اس "خاکے"[3] میں توجہ

---

[1] سر جارج ابراہام گریرسن نے حکومت ہند کی امداد سے ہندستان کی زبانوں کا جائزہ لیا اور اپنی تحقیقات کے نتائج گیارہ جلدوں میں شائع کیے۔ یہ جائزہ "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" کے نام سے مشہور ہے۔
[2] جان بیمز کے تھوڑے سے حالات اسی کتاب کے دیباچے میں دیے گئے ہیں۔
[3] بیمز کی اس کتاب کے لیے میں نے کہیں کہیں صرف "خاکے" استعمال کیا ہے۔

نہیں کی ہے بلکہ اس میں تو اس نے ہندستان کی اکثر آریائی اور غیر آریائی زبانوں اور بولیوں کا تذکرہ کرکے خلط بحث کر دیا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی زبان کی خصوصیت یا کسی ہندستانی زبان کا ارتقاء واضح نہیں ہوتا، اہم زبانوں کا تذکرہ بھی اتنا ہی نامکمل اور ادھورا ہے جتنا معمولی بولیوں کا۔

اس کتاب میں بیمز نے اس بات کو کئی جگہ تسلیم کیا ہے کہ ہندی ہی ملک کی سب سے زیادہ عام زبان ہے لیکن اس کے باوجود نہ تو اس کی ابتداء پر روشنی ڈالی ہے اور نہ ان بولیوں کا تذکرہ خاص طور سے کیا ہے جن کے مجموعے کا نام ہندی ہے۔ اس "خاکے" کے مطالعہ سے یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتی کہ اردو کو وہ ہندستان کی زبانوں میں کون سی جگہ دینا چاہتا ہے کہیں کہیں وہ اردو کے لیے ہندستانی کا لفظ استعمال کرتا ہے کہیں ہندی بولیوں کے مقابلہ میں علمی زبان کا ذکر کرتے ہوئے اردو کو علمی زبان بتاتا اور اس کے جاننے کو تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اردو زبان کے متعلق اس کی رائے بہت واضح نہیں ہوتی لیکن جب ہم اس کی کتاب "ہندستان کی جدید آریائی زبانوں کی تقابلی قواعد"[1] کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے خیالات کسی حد تک ظاہر ہو جاتے ہیں "تقابلی قواعد" کے صفحہ ۸ پر اس نے لکھا ہے کہ موجودہ زمانے میں (یعنی ۱۸۷۲ء) اردو سارے ہندستان میں استعمال ہوتی ہے۔ "خاکے" میں یہی بات ہندی کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس سے کم سے کم یہ نتیجہ تو ضرور نکلتا ہے کہ وہ ہندی اور اردو کو الگ الگ دو زبانیں تسلیم نہیں کرتا اور دونوں کی مجموعی حیثیت کے لئے اکثر

---

[1] بیمز کی مشہور کتاب "اے کمپیریٹیو گرامر آف دی ماڈرن اریین لنگویجز" ہے۔ اس مقدمہ میں اس کی پہلی جلد سے مدد لی گئی ہے اور اختصار کے لیے اسے صرف "تقابلی قواعد" لکھا گیا ہے۔

ہندی ہی کا لفظ استعمال کرتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے اُسے بہت سے لوگوں نے ہندی کا حامی سمجھ لیا ہے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر تارا چند نے بھی اپنی انگریزی کتاب "ہندستانی کا مسئلہ" (دی پرابلم آف ہندستانی) کے صفحہ ۳۳ پر یہی خیال ظاہر کیا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں ہے کسی عالم لسانیات نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا ہے۔ اسی وجہ سے بیمز بھی ان کا ذکر الگ الگ نہیں کرتا لیکن جب ہندستان کی اُس زبان کے تذکرے کا موقع آتا ہے جسے تمام پڑھے لکھے لوگ استعمال کرتے ہیں تو وہ لکھتا ہے :-

"یہ عام بولی بہ ظاہر قدیم دارالسلطنت دہلی کے گرد و نواح میں پیدا ہوئی اور اس علاقے کی بولی کی ہندی ہی شکل، زبان کے اس نئے دور کی بنیاد کے لیے تدریجاً اختیار کی گئی، اس میں اگر مشتقات، اسما، اور افعال خالصتاً اور مطلقاً ہندی کے رہے اور عام بول چال کے الفاظ بھی ہندی ہی کے باقی رہے، لیکن فارسی، عربی اور ترکی کے بہت سے الفاظ اسی طرح جگہ پا گئے جس طرح انگریزی میں یونانی اور لاطینی لفظ لیکن ان الفاظ نے کسی طرح بھی خود زبان کے ڈھانچے کو تبدیل یا متاثر نہیں کیا۔ یہ زبان اپنے اشتقاقی اور صوتی عناصر کے لحاظ سے وَلی اور سودا کے اشعار میں بھی اسی طرح خالص آریائی بولی باقی رہی جس طرح تلسی داس اور بہاری لال کے صفحات پر، اس لیے اگر کوئی شخص ہندی اور اردو کو دو زبانیں کہتا ہے تو وہ اس مسئلہ کی نوعیت ہی کو بالکل غلط سمجھنے اور علم اللسان سے قطعاً ناواقف ہونے کا ثبوت دیتا ہے"

جب بعض ہنگامہ ساز یہ آواز بلند کرتے ہیں کہ ہندوستان کی انگریزی عدالتوں کی زبان اردو کے بجائے ہندی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلرک اور محرر اس بات سے روکے جائیں کہ فارسی اور عربی کے بہت زیادہ الفاظ استعمال نہ کریں بلکہ اس کے بجائے سنسکرت سے اخذ کئے ہوئے[1] لفظ (تدبھو) لکھیں جن کی ہندی میں بہتات ہے اس میں کوئی نقصان نہیں کہ ایسا ہو لیکن کوئی یہ نہ کہے کہ اردو ہندی سے الگ کوئی زبان ہے۔ (تقابلی قواعد صفحہ ۳۱-۳۲)

اسی سلسلہ میں بیمز نے یہ بھی لکھا ہے کہ سب سے زیادہ صحیح تو یہ ہوگا کہ ہم اسے ہندی کی اردو بولی یا "ہندی کا اردو روپ" کہیں کیوں کہ اردو کا کوئی ایسا جملہ لکھنا ناممکن ہے جس میں آریائی الفاظ نہ ہوں اس کے برعکس ایسے بہت سے جملے لکھے جا سکتے ہیں جن میں فارسی کا ایک لفظ بھی نہ ہو یہیں بیمز نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ عربی، فارسی الفاظ کی آمیزش سے ہندی کو غیر معمولی فائدہ پہونچا کیوں کہ وہ سنسکرت کی طرف جانے سے بچ گئی اور سنسکرت کا بہت زیادہ سہارا لینے کی وجہ سے ہندستان کی کئی زبانوں کو بہت نقصان پہونچ گیا ہے۔ بیمز کہتا ہے کہ :-

"ہندی کو دوسری ہندستانی زبانوں پر اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ اس میں خالص سنسکرت الفاظ (تت سم) کے بجائے اُن سے اخذ کئے ہوئے الفاظ (تدبھو) لئے گئے ہیں یا پھر اس نے وہ بہت زیادہ مستعمل شکل اختیار کرلی ہے جس میں فارسی اور عربی کے خوش نما اور لطیف الفاظ داخل کرلیے گئے ہیں"

---

[1] ہندی کا میں جو الفاظ سنسکرت سے جوں کے توں لے لیے گئے ہیں انھیں اصطلاحاً تت سم الفاظ کہا جاتا ہے۔ جو الفاظ سنسکرت یا قدیم پراکرتوں سے لیے گئے ہیں لیکن ان کی شکل بدل دی گئی ہے انھیں تدبھو کہتے ہیں جو الفاظ کا ماخذ سنسکرت میں نہ ملے انھیں دیشج یا دیسی کہتے ہیں۔ یہ اصطلاحات تقابلی لسانیات میں عام طور سے استعمال ہوتی ہیں۔

جسے کبھی اردو کہا جاتا ہے اور کبھی ہندستانی۔" (تقابلی قواعد صفحہ ۳۴)

یہاں اس بحث میں پڑنے کا موقع نہیں ہے کہ اردو ہی کو ہندستانی کہا جائے یا ہندی اُردو دونوں کو لیکن بیمز نے اپنے خیالات اسی طرح ظاہر کئے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ خیالات ۱۸۷۲ء کے قریب ظاہر کئے گئے تھے۔ اُس وقت سے اب تک ہندستان میں غیر معمولی تغیرات ہو چکے ہیں اور امیدوں کی بہت سی شکلیں بن کر بگڑ چکی ہیں۔ گو ہندی اردو تنازعہ شروع ہو چکا تھا لیکن اس کی یہ شکل نہ تھی جو آج ہے اس لئے اس وقت لسانی حیثیت سے ہندوستان کی زبانوں کے مستقبل پر غور کرتے ہوئے کوئی نتیجہ نکالنا آسان تھا۔ چنانچہ بیمز نے بھی پیشین گوئی کی ہے وہ لکھتا ہے:-

"اس گروہ کی زبانوں کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کیونکہ بہت کچھ سیاسی حالات پر منحصر ہے جنھیں کوئی دیکھ نہیں سکتا لیکن بہت قوی امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سڑکوں، ریلوں اور دوسرے ذرائع حمل ونقل کی زبردست ترقی کے ساتھ ساتھ راجپوتانہ کی بہت سی بولیاں اور پنجابی ختم ہو جائیں گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندی کی فارسی آمیز شکل ایک عام زبان کی حیثیت سے دریائے سندھ سے راج محل تک اور ہمالیہ سے بندھیاچل تک رائج ہو جائے گی .... اس کا اثر بھی یہ زبانوں پر بھی ہوگا ...... مختصر یہ کہ جب صوبائی حد بندیوں سے پیدا ہونے والی علیحدگی پسندی ختم ہو جائے گی اور ملک کے مختلف حصوں میں آمد و رفت کی آزادیاں بڑھیں گی۔ اس وقت وہ واضح، آسان، لچکدار اور اظہار کی زبردست طاقت رکھنے والی اردو زبان جو آج بھی ہندستان کے بیشتر

حصوں کی لنگوا فرینکا یعنی ملکی اور قومی زبان ہے اور جو خود حاکموں کی زبان سے مخصوص مشابہت رکھنے کی وجہ سے ان کو بھی پسند ہے یہاں کی عام زبان بن جائے گی۔ بلا شک و شبہہ یہ زبان مستقبل میں کسی وقت اگر تمام صوبوں کی بولیوں کو نہیں تو اکثر کو ہٹا کر ان کی جگہ لینے کی قسمت لے کر آئی ہے۔ اسی کے لئے یہ بھی مقدر ہوا ہے کہ وہ سارے آریائی ہند کو یکساں ترقی یافتہ زبان دے، ایسی زبان جو درحقیقت دنیائے ہند کی انگریزی بن جائے۔" (تقابلی قواعد صفحہ ۱۲۰-۱۲۱)

اسی طرح بسنہ ۱۸۶۷ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل میں لکھتے ہوئے بیمز نے اردو ہی کو ہندستان کی عام زبان قرار دیا اور عربی فارسی کے مستعمل الفاظ کو ہندستانی سے نکالنے کو جنون سے تعبیر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے اصولوں سے واقفیت رکھنے والا ہندستان میں اردو کی حیثیت کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ ہندستانی تمدن کے فطری ارتقا کا ناگزیر نتیجہ ہے جسے بیمز نے بھی تسلیم کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا، بیمز نے اس "خاکے" میں ہندی اور اردو کے ارتقا پر تفصیلی بحث نہیں کی ہے بلکہ لسانیات کی ابتدائی معلومات رکھنے والوں کو ہندستان کی مختلف زبانوں اور ان کی واضح خصوصیتوں سے روشناس کرایا ہے۔ اس ضمن میں اس نے بہت سی مفید باتیں لکھیں ہیں۔ اس نے دراوڑی، تبتی، چینی اور پہاڑی بولیوں کو خاص اہمیت دی ہے، ان کا مطالعہ لسانیات کے طالب علم کے لیے مفید ہوگا لیکن ہندستانی کے سمجھنے میں ان سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔ بیمز نے فلسفہ لسا

کے اصول بھی باقاعدہ اس کتاب میں پیش نہیں کیے ہیں گو ضمناً بہت سی باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ یہاں ان پر کوئی تفصیلی تبصرہ کرنے کے بجائے ہندستانی زبانوں کے طالب علموں کے لئے چند صفحات میں اردو کی لسانیاتی حیثیت کو واضح کر دینا زیادہ مفید ہوگا۔

زبان اور سماج

انسان سب سے پہلے کہاں پیدا ہوئے؟ ان کی زندگی کی سماجی نوعیت کیا تھی؟ سب سے پہلے انھوں نے کون سی زبان استعمال کی؟ پہلے پہل کئی زبانیں پیدا ہوئیں یا صرف ایک؟ جانوروں اور انسانوں میں کیا خاص فرق ہیں اور زبان کی ان میں کیا حیثیت ہے؟ زبان کسے کہتے ہیں؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ کیا زبان کو انسان کی ایجاد کہا جا سکتا ہے؟ یہ اور ایسے بہت سے دوسرے سوالات ہیں جو زبان کی سماجی حیثیت پر غور کرتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں اور جن پر ہمیشہ بحث ہوتی رہتی ہے لیکن کسی نتیجہ کو قطعی شکل میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس ساری بحث میں جو باتیں واضح ہیں وہ یہ ہیں کہ تاریخ کے کسی ایسے دور کا پتہ نہیں چلتا جب روئے زمین کی تمام آبادی ایک ہی زبان بولتی رہی ہو۔ زبان انسانوں نے پیدا کی اور گو اس میں ابتداءً قصد اور ارادے کو بہت زیادہ دخل نہیں تھا لیکن انسان کی سماجی ضروریات نے اسے اظہارِ خیال پر مجبور کیا اور اس کی ترقی یافتہ جسمانی اور دماغی ساخت نے اسے اظہارِ خیال کے وہ ذرائع دیے جن تک جانوروں کی رسائی نہ تھی۔ یہ کہانی بہت طویل اور دلکش ہے کہ انسان ترقی کے اس زینے پر کیوں کر پہونچا لیکن یہاں اس کے چھیڑنے کا موقع نہیں۔ زبان بنی بنائی شکل میں انسان کو نہیں ملی بلکہ اس کی حیثیت ایک مسلسل عمل کی تھی۔ اظہارِ خیا

کی کش مکش ہیں جہاں ایک طرف اس کو ذہنی نشو ونما کے مواقع مل رہے تھے وہاں دوسری طرف جسم کے وہ اعصاب اور اعضا اس کے قابو میں آرہے تھے جن کی مدد سے وہ آوازوں کو اپنی مادّی ضروریات کی تکمیل کے لیے استعمال کرسکے۔ ابتدائی انسانوں کی زندگی کے تجربات گویا اُس کے اور فطرت کے درمیان نئے رشتے قائم کر رہے تھے جنھیں وہ قابو میں لاکر اپنے کام کا بنانا چاہتا تھا۔ یہی چیز اُس کے اور جانوروں کے درمیان مابہ الامتیاز تھی۔ اپنے ذہن سے باہر اُسے مادی چیزوں کے وجود کا علم ہوا جنھیں وہ اپنے ذہن سے الگ بھی دیکھ سکتا تھا اور اُن چیزوں کو اپنے ذہن اور علم میں قید کرلینے کی خواہش میں اُس نے قوت گویائی سے کام لیا، اُسے بڑھایا اور ترقی دی۔ عناصر فطرت پر قابو پانے میں اس نئی قوت گویائی سے بڑی مدد ملتی تھی کیونکہ اجتماعی زندگی کو باندھے رکھنے کا وہ بھی ایک ذریعہ تھی۔ اس لیے زبان ہر قدم پر انسانی عمل سے وابستہ ہوگئی۔

اس مختصر مقدمہ میں اس بحث کو اور طول دینے سے فائدہ نہیں۔ صرف اتنا اشارہ مقصود ہے کہ زبان کی حیثیت سماجی ہے اور اگر ہم اس کا مطالعہ اس بات کو نظر انداز کرکے کریں گے تو کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکیں گے۔[۱] تو جیسپرسن نے اپنی تصنیف "نوع انسان

---

[۱] اس سلسلہ میں حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔

1. ANIMAL BIOLOGY BY HUXLEY AND HALDANE.

2. THINKING BY H. LEVY.

3. FOUNDATIONS OF LANGUAGE BY L. H. GRAY.

4. A SHORT HISTORY OF CULTURE BY J. LINDSAY.

5. WHAT HAPPENED IN HISTORY BY G. CHILDE.

قوم اور فرد[ف] میں اس پہلو پر لطیف بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان ہر وقت اظہار خیال یا ابلاغ ہی کے لیے زبان استعمال نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی صرف معاشرتی اور سماجی زندگی سے وابستگی ظاہر کرنے کے لیے بھی کچھ کہتا ہے۔ جب یہ بات متعین ہو جاتی ہے تو پھر یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں رہ جاتا کہ لسانی تغیرات سماجی ارتقا کے تابع ہوتے ہیں اور گو زبان کا بڑا حصہ فطری نشوونما کا حامل ہوتا ہے لیکن انسان کی سماجی ضرورتیں اس کی تشکیل کرتی ہیں اور بالارادہ اس میں تغیرات بھی پیدا کر سکتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سماج کے مختلف طبقات اپنے معیار زندگی کے لحاظ سے ایک ہی زبان کو مختلف طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا سے ناواقفیت اور ہر قسم اور ہر سطح کے انسانی سماج میں اس کے وجود کی وجہ سے زبان کی ایک روایت بن جاتی ہے اور بہت سے لوگ زبان سے ایک طرح کا صوفیانہ یا مابعد الطبیعیاتی تصور وابستہ کر کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کا تعلق وراثت، خون یا نسل وغیرہ سے ہے، یہی نہیں بلکہ بعض لوگ یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ لفظ اور اس کے معنی میں کوئی باطنی رشتہ ہے جس کا پتہ چلانا محال ہے لیکن علم اللسان میں ان خیالات کی کوئی جگہ نہیں۔ کوئی شخص زبان ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہر بچہ اپنے گرد و پیش سے زبان اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح اس کے پیش رو ں نے سیکھا تھا۔

یہ بتانا تو بہت مشکل ہے کہ زبان کسے کہتے ہیں لیکن سمجھنے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ (زبان آوازوں کے ایک ایسے مجموعے کا نام ہے جسے انسان اپنا خیال دوسروں پر ظاہر کرنے کے لیے ارادتاً نکالتا ہے اور ان آوازوں کے معنی معین

[ف] MANKIND, NATION AND INDIVIDUAL.

کر لیے گئے ہیں تاکہ کہنے اور سننے والے کے یہاں ایک لفظ سے تقریباً ایک ہی جذبہ پیدا ہو۔ الفاظ ان ذہنی تصویروں کی ملفوظی علامتیں ہیں جنھیں ہم دوسروں کے ذہن تک پہونچانا چاہتے ہیں) اس طرح زبان ایک بڑا پیچیدہ موضوع بن جاتی ہے کیونکہ کہنے والا ایک میکانکی اور جسمانی ذریعہ سے (یعنی آوازوں کی مدد سے) سننے والے کے دماغ میں ایک نفسیاتی کیفیت پیدا کرتا ہے اور زبان تالو، حلق، دانت، ہونٹ اور پھیپھڑے کے مرکب اور پیچ در پیچ عمل سے دماغ کے دو حصے تقریباً یکساں طور پر اثر پذیر ہوتے ہیں جن میں خیال پیدا ہوتے ہیں اور جو آوازوں سے بنی ہوئی ملفوظی تصویروں کے معنی جانتے ہیں اس طرح مطالعۂ زبان کے دو اہم حصے ہو جاتے ہیں: ایک میکانکی یا عضویاتی اور جسمانی جس کا تعلق صوتیات سے ہوتا ہے اور دوسرا نفسیاتی جس کا تعلق معنی اور اس کے تغیرات سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کی سماجی حیثیت کا مطالعہ بھی عام مطالعۂ لسان اور ارتقائے تمدن کا ایک اہم جزو بن جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب زبان کا مطالعہ صوتی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو آواز اور اس کی قسموں، الفاظ کی پیدائش، ان کی ساخت اور قانون تغیر اصوات کا مطالعہ بھی ضروری ہو جاتا ہے اور جب الفاظ کو معنی کے رشتہ میں دیکھا جاتا ہے تو کلام کے اجزائے ترکیبی اور صرف و نحو کے ڈھانچے کھڑے ہوتے ہیں اور یوں علم اللسان کے بہت سے شعبے ہو جاتے ہیں جن کا مطالعہ الگ الگ بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک ساتھ بھی۔

موجودہ عہد میں زبان کا مطالعہ خاص طور سے آوازوں کے صحیح طور پر لکھنے اور ادا کرنے، ہر زبان میں حروف علت اور حروف صحیحہ کو سائنٹفک طریقہ سے

تقسیم کرنے اور آواز کے بنیادی عنصر کو گرفت میں لانے کی کوششوں پر مبنی ہے۔ اس سے جو عملی فائدہ مقصود ہے وہ یہ کہ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بھی کم وقت میں صحت کے ساتھ سیکھی جا سکیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں کل کتنی آوازیں ہیں لیکن اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر آواز دوسری آواز سے ممتاز کر کے تحریر میں قید کی جا سکے، آوازوں کی قسموں اور اُن کے باریک فرق کو سمجھنا، زبان کے اندر جو تبدیلیاں صوتی حیثیت سے ہوتی رہتی ہیں، اُن کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

نشاۃ زبان: زبان جب اور جس طرح بھی پیدا ہوئی ہو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جب انسان نے اتنی ترقی کر لی کہ اسے جماعتی زندگی میں اظہار خیال کی ضرورت پیش آئی اور اشارے یا معمولی آوازیں اس کی ذہنی پیچیدگی کا ساتھ نہ دے سکیں اس وقت زبان وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ ترقی کرتی گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبان اور خیال میں کیا تعلق ہے؟ پہلے زبان وجود میں آئی یا خیال۔ گو ماہرین علم النفس نے بھی ان مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالی ہیں لیکن زیادہ تر علما کا رجحان اس جانب ہے کہ خیال کو زبان کے مقابلے میں اولیت حاصل ہے۔ عام انسانی زندگی اور اُس کے سماجی مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ تمدن اور خیال کے پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان بھی نئی وسعتیں حاصل کرتی ہے، ان کا اظہار کبھی نئے الفاظ اور مرکبات شامل کر کے کیا جاتا ہے کبھی معنی میں تغیرات کر کے

نموئے لسان میں جو عناصر کام کرتے ہیں ان سب کا شمار یا تجزیہ ممکن نہیں ہے

کیونکہ اس پر ماحول، طرز تمدن، جسمانی اور دماغی مشاغل، تعلیم اور آداب وعادات کے علاوہ دوسرے خارجی اسباب بھی کم یا زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔ طبعی اور جغرافیائی اثرات نسلی اختلاط، ہمسایہ ملکوں سے سیاسی اور اقتصادی تعلقات، فن اور ادب کے اثرات سب کام کرتے ہیں۔ ان کے تناسب کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تعلیم اور قومی اتحاد کے جذبے کے ماتحت زبانوں پر زبردست اثر پڑتا ہے۔ یہ اثر کبھی زبانوں اور بولیوں کی یکسانی اور اتحاد کی شکل میں رونما ہوتا ہے کبھی اختلاف کی شکل میں۔ قومیت کا احساس، بین الاقوامی تصورات، اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کے منصوبے، اکثریت اور اقلیت کے مناقشے سب ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو کر زبان کے مسئلہ کو اس قدر پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ اس کے تغیرات کا سائنٹفک تجزیہ اگر محال نہیں تو تقریباً محال ضرور ہو جاتا ہے لیکن ماہرین لسانیات نے ان عناصر اور اسباب پر غور کیا ہے جن سے زبان میں صوتی یا معنوی تغیر ہوتا ہے اور جن سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات سے زبان کے نشو ونما میں فرق پیدا ہوتا ہے یعنی کن طاقتوں کے عمل اور ردّ عمل سے کبھی کوئی زبان تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر لیتی ہے کبھی اس کی باڑھ رک جاتی ہے۔ ہر زبان کے ارتقا اور زوال کو اس کے مخصوص لسانی، تاریخی اور سماجی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے کیوں کہ میکانکی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں مفید نہیں ہو سکتا۔

اس طرح لسانیات کے مطالعہ میں دو طریقے عام طور سے رائج ہیں جنھیں تاریخی یا تقابلی اور توضیحی یا تجزیاتی طریقہ کہا گیا ہے۔ اول الذکر میں زبان میں تبدیلی کے ارتقائی عمل کو دیکھا جاتا ہے اور آخر الذکر میں صوری ہیئتی اور صوتی

تبدیلیوں کو۔ لسانیات کا صحیح علم دونوں کو پیش نظر رکھ کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ علم اللسان کے مطالعے کے مختلف شعبے ہو گئے ہیں جن میں خاص خاص صوتیات، الفاظ کی ساخت، معانیات، صرف، نحو، علم اللغات اور ان کی شاخیں ہیں۔ جن پر الگ الگ درجنوں کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

دنیا کی زبانیں

جیسا کہ کہا جا چکا ہے ابھی تک یقینی طور پر یہ بات طے نہیں ہوئی کہ انسان سب سے پہلے کہاں پیدا ہوئے اور کس زبان میں انھوں نے ابتدأ اپنے خیالات ظاہر کیے۔ اکثر علما نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ زبان کی ابتدا کا سراغ لگانا اندھیرے میں ٹٹولنا ہے اور اندھیرے میں ٹٹولنے سے کوئی فائدہ نہیں جس جگہ سے واقعات ہمیں روشنی دکھاتے ہیں وہیں سے مطالعہ شروع کرنا چاہیے لیکن نامعلوم کو جان لینے کی پیاس اتنی شدید ہوتی ہے کہ آج بھی بہت سے علمائے تمدن ابتدائی انسانوں اور ان کی زبان وغیرہ کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ وسطی یورپ میں دریائے ڈینوب کی وادی کو انسان کی پہلی جائے پیدائش بتانے والے آج بھی موجود ہیں لیکن دورِ جدید میں عام رجحان اس طرف پایا جاتا ہے کہ وسطی ایشیا کو ترجیح دی جائے۔ تمدن کی تاریخیں اور علم الانسان کی کتابیں ان بحثوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اگر یہ علوم بھی ہو جائے کہ ابتدائی انسان کس جگہ پیدا ہوئے تو بھی یہ بتانا آسان نہ ہوگا کہ ان کی زبان کیا تھی کیوں کہ مواد کے بغیر زبان کا مطالعہ نہیں ہو سکتا اور زبان کا قدیم مواد صرف تحریری شکل میں ہم تک پہونچ سکتا ہے لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ تحریری زبان، بولی کی زبان کے بہت دنوں بعد وجود میں آئی اور تحریر کا علم انسانوں کو بہت بعد میں ہوا، زمانۂ ماقبل تاریخ کی زبان کا حال کون بتا سکتا ہے!

"تاریخ تمدن ماضی میں جہاں تک رہنمائی کرتی ہے، اس میں مختلف قسموں کے انسان کرۂ ارض کے مختلف خطوں پر چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، ان کی زبانیں بھی ایک نہیں رہیں، اس لیے شروع ہی سے زبانوں کو مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں بعض لوگوں نے یہ غلطی کی کہ زبانوں کو نسلوں کے ساتھ وابستہ کر دیا، یہ ایک ایسی خوش فہمی تھی جسے جدید مفکرین صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ زبانوں کی نسلی تقسیم ہمیں صرف زبانوں کے گروہوں اور خاندانوں کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے ورنہ اس سے یہ مقصود نہیں کہ نسل اور زبان میں کوئی ناقابل تغیر تعلق ہے۔

پھر آخر زبانوں کو خاندانوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے؟ یہ سوال اس لیے ضروری ہے کہ دنیا کی بعض زبانیں اپنی ساخت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ انھیں ایک ہی جگہ نہیں رکھا جا سکتا اور اگر رکھا جائے تو ان کا سائنٹفک مطالعہ ایک ساتھ نہیں کیا جا سکتا اس لیے انھیں کئی گروہوں میں تقسیم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کچھ زبانیں ایک دوسرے کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں کچھ ایک دوسرے سے ملتی جلتی نہیں، ایک ساتھ رکھ لیا جاتا ہے۔ صوتی حیثیت اور لفظوں کی بناوٹ کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ساخت بھی اس تعلق کا پتہ چلانے میں مدد دیتی ہے۔ اچھے ماہرین لسانیات یہی طریقہ اختیار کرتے رہیں لیکن زبانوں کا عام مطالعہ کرنے والے انھیں کے بنائے ہوئے لسانی شجروں اور نسب ناموں کا تاریخی مطالعہ کرکے اپنا کام نکال لیتے ہیں۔

صوتی کیفیات، الفاظ کی ساخت، جملوں اور فقروں میں الفاظ کی ترتیب کو دیکھتے ہوئے زبان کو کئی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے چار قسمیں اہمیت رکھتی

ہیں۔ پہلی قسم میں تو وہ یک لفظی زبانیں آتی ہیں جو غیر نمو پذیر ہیں اور جن کے الفاظ اپنی جگہ پر تنہا مکمل ہوتے ہیں، نہ اُن کی شکل تبدیل ہوتی ہے، نہ ان میں کوئی لفظ یا کسی لفظ کا جزو جوڑ سکتے ہیں اور نہ اُن سے کوئی لفظ مشتق ہوتا ہے، ان کی گردان نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کی سب سے مشہور مثال چینی زبان کی ہے۔ دوسری قسم اُن زبانوں کی ہے جو بنیادی لفظ میں دوسرے الفاظ یا الفاظ کے ٹکڑے جوڑنے سے بنتی ہیں، ان کے یہ جوڑ الگ الگ کئے جا سکتے ہیں، ہر جوڑ اپنی جگہ الگ معنی رکھتا ہے یا رکھتا رہا ہوگا، اس کی سب سے زیادہ واضح اور معروف مثال ترکی ہے تیسری قسم سب سے عام اور سب سے زیادہ وسیع الذیل ہے، اسے اشتقاقی کہتے ہیں۔ اس زبان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بنیادی لفظ یا مادہ میں الفاظ یا اجزائے الفاظ جوڑ کر نئے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں، یہ نئے الفاظ حالت اور زمانے کے تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئی معنوی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اس میں اکثر سامی اور آریائی زبانیں شامل ہیں لیکن پھر دوسرے اختلافات ایسے ہیں جن کی وجہ سے آریائی اور سامی زبانوں میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے اور دونوں اپنی ساخت کے اعتبار سے بالکل دو خاندانوں میں رکھی جاتی ہیں۔ چوتھی قسم تحلیلی کہی جاتی ہے۔ یہ اشتقاقی زبان کی ایک بہتر اور ترقی یافتہ شکل ہے جس میں اشتقاقی یا مشتق جزو اصل لفظ میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ اُس کے الگ وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ جو سابقے یا لاحقے اشتقاقی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں وہ تحلیلی منزل میں پہونچ کر صوتی تغیرات اور دوسری وجہوں سے اس طرح غائب ہو جاتے ہیں، کہ کسی لفظ میں جوڑے ہوئے اجزا کو ڈھونڈھ نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اکثر زبانیں

ارتقا کی اسی منزل میں ہیں یعنی ترکیبی سے تحلیلی کی جانب قدم بڑھا رہی ہیں۔

زبانوں کی گروہ بندی کبھی قسموں کی بنیاد پر کی جاتی ہے کبھی تاریخی یا خاندانی اور کبھی نفسیاتی لیکن سب سے زیادہ پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ زبان کی آوازوں اور بناوٹ کی خصوصیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تاریخ اور آثار قدیمہ کی روشنی میں انھیں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جائے۔ زبان کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ایک دشواری اور پیش آتی ہے جس سے کئی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ زبان اور بولی میں ماہرین لسانیات نے فرق کیا ہے اس لئے دنیا کی زبانوں کی تعداد معین کرنا اور دشوار ہو جاتا ہے۔ پھر بھی بعض علما اور بعض اداروں نے دنیا کی تمام زبانوں کی تعداد معین کرنے کی کوشش کی ہے (اس میں بولیاں شامل نہیں ہیں) چنانچہ امریکی مصنف لوئی گرے نے فرنچ اکیڈمی[1] کی تحقیقات پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا میں کُل دو ہزار سات سو چھیانوے (2796) زبانیں مستعمل ہیں۔ اکیڈمی نے انھیں چھبیس[۲۶] گروہوں میں تقسیم کیا ہے، یہ تقسیم ایسی ہے کہ اس میں اختلاف رائے ہے اور ہو سکتا ہے۔ بعض ماہرین لسانیات نے کرۂ ارض کو صرف چار لسانی حلقوں میں تقسیم کر دیا ہے اور پھر دنیا بھر کی زبانوں کو انھیں کے تحت رکھا ہے۔ بعض نے یہ تعداد بڑھا کر آٹھ کر دی ہے اور تمام زبانوں کو انھیں کی شاخ بتایا ہے۔ آخرالذکر تقسیم زیادہ صحیح تسلیم کی گئی ہے اور عام مطالعہ کے لئے آسان صورتیں بھی پیدا کرتی ہے۔ اس مختصر مقدمہ میں

---

[1] اکیڈمی ادارۂ علمیہ کو کہتے ہیں۔ افلاطون جہاں اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتا تھا اُسے اکیڈمی کہتے تھے، مختلف ملکوں میں اکیڈمیاں قائم ہیں۔ فرانسیسی اکیڈمی ۱۶۳۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ انقلاب فرانس کے زمانے میں بند ہو گئی تھی پھر زندہ کی گئی۔ اس کے مختلف شعبے ہیں جو علمی ادبی خدمت کرتے رہتے ہیں اس میں اکثر بڑے فرانسیسی علما اور ادیب شریک نہیں رہے ہیں۔

ان کا تذکرہ صرف ضمنی حیثیت رکھتا ہے اس لیے محض اُن کے نام کافی ہوں گے۔ اُن کے کسی قدر مفصل مطالعہ کے لیے مقدمہ کے آخر میں دی ہوئی بعض کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔ آٹھ بڑے لسانی خاندانوں کے نام یہ ہیں :-

(۱) سامی - عربی — (۲) افریقہ کی بانٹو
(۳) دراوڑ — (۴) ہند چینی
(۵) ملا یائی — (۶) منڈا
(۷) امریکی — (۸) ہند یوروپی = Ahir of Urdu & Hindi

اردو، ہندی اور ہندستانی کے مطالعہ کے لیے ہند یوروپی خاندان کا مطالعہ اصل کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ بھی اس کی تمام شاخوں کا نہیں بلکہ صرف اُن کا جن سے اُردو ہندی کا سلسلۂ نسب مل جاتا ہے ضمنی طور پر سامی اور دراوڑی کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ سامی زبان کے لغات ہندستانی زبانوں میں پائے جاتے ہیں اور دراوڑ خاندان ہندوستان کی بہت اہم زبانوں کا خاندان ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میں منڈا یا کول زبانیں بھی پائی جاتی ہیں اس لیے ان پر بھی نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔

سامی زبانوں میں ہمارے نقطۂ نظر سے عربی سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ یہ زبان ہندوستان پہونچی اور مختلف صورتوں میں فارسی کے اندر سے ہوتی ہوئی ہندوستانی زبانوں پر اثر انداز ہوئی۔ براہ راست اس کا اثر بہت کم ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اثر صرف اسماء اور صفات تک محدود ہے۔ ہندوستان کی کسی زبان پر اساسی حیثیت سے اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ دراوڑ زبانیں صرف

جنوبی ہندستان میں (اور بلوچستان کے بعض خطوں میں) بولی جاتی ہیں۔ انھوں نے بھی اردو کے ارتقا پر اثر نہیں ڈالا ہے، ابتدائی دکنی ادب میں چند الفاظ او رمحاورات کے سوا اردو زبان کی ساخت پر ان کا بھی کوئی اثر نہیں ہے۔ منڈا زبانیں غیر متمدن وحشی قبائل کی زبانیں ہیں اور بعض پہاڑی علاقوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کا ذکر بھی ضمناً آسکتا ہے، اردو یا ہندی کے ارتقا سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے

ہند یورپی خاندان بہت بڑا خاندان ہے۔ اس کو بھی کئی شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کا تعلق اردو کے مطالعہ سے نہیں ہے۔ اس کے تحت میں آنے والی زبانوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) آرمینی　　(۲) بالٹو سلافی

(۳) البانوی　　(۴) یونانی

(۵) اطالوی　　(۶) کیلٹک

(۷) ٹیوٹانی　　(۸) ہند آریائی (ہند ایرانی) (ہند اریائی)

اس فہرست میں آخری خاندان کے علاوہ اور کسی زبان کا مطالعہ اردو زبان کے مطالعہ میں عمومی حیثیت سے مفید نہ ہوگا، ہند آریائی زبان کو تاریخ کے اس خاص دور میں جب آریہ قوم ایران میں تھی ہند ایرانی کہنا زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ اس طرح اس میں ایران اور ہندوستان دونوں جگہوں کی زبانوں کا تذکرہ شامل ہو جائے گا اور جب ایرانی زبانوں سے قطع نظر کر کے صرف ہندوستان کی زبانوں کا مطالعہ مقصود ہو اس وقت ہند یورپی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانوں کو ہند آریائی کہنا درست ہوگا۔ ایرانی کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ سنسکرت اور

قدیم ایرانی کی مماثلت کے علاوہ شمالی مغربی ہندوستان کی بعض زبانیں آج بھی ایرانی خاندان کی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں جن میں سے پشتو اور بلوچی کو جدید ایرانی زبانوں کی حیثیت سے اور پیشاچی خاندان کی کشمیری، شنا، کافر اور چترالی وغیرہ کو ایرانی اور سنسکرت کی بگڑی ہوئی زبانوں کی حیثیت سے ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں استعمال کیا جا رہا ہے۔

اس تمہیدی بحث کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ہند آریائی زبان سے کون سی زبان مراد ہے؟ اس کی تاریخ کیا ہے اور ہندوستان میں اس آریائی زبان کا ارتقا کس طرح ہوا؟ ہندوستان میں قومی زبان کی تشکیل کا مسئلہ بھی اسی کے لسانیاتی مطالعہ سے وابستہ ہے اس لئے مختصراً اسی کو پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان اور آریہ

تاریخی تحقیقات نے اب تک اس بات کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا کہ آریہ قوم ہندوستان میں کب آئی مختلف مورخین نے ڈھائی ہزار سال قبل مسیح سے لے کر ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح تک کا درمیانی زمانہ آریوں کے پنجاب میں پہونچنے کا قرار دیا ہے۔ جب آریہ قوم کے لوگ ہندوستان میں آنا شروع ہوئے اس وقت یہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے جو آریوں سے پہلے ہندوستان میں آکر بس گئے تھے۔ ان میں افریقہ سے آئے ہوئے نگرائڈ تھے جن کے نشانات اب تک جزائر انڈمان میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فلسطین سے پروٹو آسٹرالائڈ آئے اور سیلون، برما، ملایا اور آسٹریلیا میں پھیل گئے پھر آسٹرک آئے اور شمالی ہندوستان کے بعض حصوں میں آباد ہو گئے یہ لوگ غالباً بحیرہ روم کے علاقے سے آئے تھے اور انھوں نے

عراق کے راستے سے یہ سفر طے کیا تھا۔ انھوں نے اپنا ایک تمدنی ڈھانچہ کھڑا کرلیا۔ ان میں کے بعض گروہ ہند چین اور انڈونیشیا کی طرف چلے گئے۔ آسٹرک گروہ کے لوگوں کی زبانیں بعض غیر متمدن قبائل میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً بیالیس لاکھ[1] ہے۔ یہ تعداد بھی گھٹتی جا رہی ہے کیونکہ جن علاقوں میں یہ لوگ آباد ہیں وہاں کی ہند آریائی زبانیں لوگوں میں رائج ہوتی جا رہی ہیں۔ ان میں سے چند خاص زبانوں کے نام یہ ہیں: کول یا منڈا، سنتھالی، کھاسی اور نکوباری۔

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد یعنی تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح دراوڑ نسل کے لوگ ہندوستان میں وارد ہوئے۔ یہ لوگ بھی بحیرۂ روم اور ایشیائے کوچک سے آئے اور ہندوستان میں پہونچ کر انھوں نے ہڑپا اور موہنجداڑو (پنجاب اور سندھ) میں تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح ایک زبردست تمدن کی بنیاد ڈالی[2]۔ یہ لوگ شمالی ہند میں پھیل کر کسی حد تک آسٹرک لوگوں سے مخلوط ہوگئے اور جب آریہ ہندوستان میں آئے تو دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا۔ آج ہندوستان میں ہند آریائی کے بعد دراوڑ زبانیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور گو یہ صرف جنوبی ہند میں محدود ہوگئی ہیں لیکن ان کے بولنے والوں کی تعداد سات کروڑ سے زیادہ ہے۔ دراوڑ خاندان کی مشہور زبانیں یہ ہیں: تامل، تلگو، ملیالم، کنڑی اور ٹولو۔ ان میں اعلیٰ

---

[1] یہ حقائق اور اعداد و شمار عام طور سے ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے مختصر رسالے "لینگویجز اینڈ لنگوسٹک پرابلمس" سے دیے گئے ہیں۔

[2] ۱۹۲۲ء میں ڈکسل داس بنرجی نے موہنجداڑو (سندھ) میں کھدائی کر کے غیر معمولی انکشافات کیے۔ اسی طرح ہڑپا (جنوبی پنجاب) میں محکمۂ آثار قدیمہ نے زمین کے نیچے سے بہت سا سامان برآمد کیا ہے جس سے دراوڑی تہذیب کی قدامت ہی نہیں بلکہ ترقی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

درجہ کا ادب موجود ہے اور برابر ترقی کر رہا ہے۔ ان کے علاوہ منگول نسل کے لوگ بھی ہندوستان میں آئے اُن کی یادگار آسام اور نیپال کی پہاڑی بولیاں ہیں ان کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ ہے۔ یہ لوگ آریوں کے بعد آئے اور ہمالہ کے دامن میں بس گئے۔

جس طرح یہ بات یقین کے ساتھ نہیں بتائی جا سکتی کہ ہند یورپی بولنے والے زمین کے کس خطے سے تعلق رکھتے تھے اسی طرح یہ بھی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم کہ آریہ قوم کہاں اور کب اس بڑے ہند یوروپی حصے سے علٰحدہ ہوئی اور کن راستوں سے ہوتی ہوئی دنیا کے مختلف حصوں میں پہونچی۔ عام خیال یہ ہے کہ آریہ روسی میدانوں یا کوہ یورال کے مشرقی اور جنوبی حصے سے چلے اور عراق ہوتے ہوئے ایران اور ہندوستان پہونچے، ایران میں وہ کتنے دن رہے، اُن کی زبان میں جغرافیائی اثر سے کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے یہ یقینی طور پر نہیں معلوم لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ مختصر ٹکڑوں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئے اور انھیں میں کے بعض گروہ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد ہندوستان آتے رہے۔ آریوں کی مختلف لہریں اپنے لسانی ورثہ اور لسانی تغیرات کے ساتھ آئیں لیکن چونکہ وہ لوگ ایران میں رہ چکے تھے اس لیے ایرانی آریوں اور ہندوستان میں آنے والے آریوں کی زبان تقریباً ایک ہی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ بھجن گائے، ایک طرح کے دیوتاؤں کی پرستش کی اور تقریباً ایک ہی طرح کی سماجی زندگی بسر کی، یہی وجہ ہے کہ ہندستانی آریوں کے قدیم ترین بھجن اور گیت جو رگ وید میں پائے جاتے ہیں ایرانیوں کی قدیم ترین مناجاتوں سے مماثلت رکھتے ہیں جو اوستا میں پائی جاتی ہیں۔ یہ مماثلت صرف معنوی نہیں ہے بلکہ صوتی اور لسانی

حیثیت سے بھی دونوں میں گہرا تعلق ملتا ہے۔میکس مُلر نے لکھا ہے کہ دونوں کی عبارتیں بہت معمولی صوتی تغیرات کی مدد سے ایک دوسرے میں تبدیل کی جا سکتی ہیں۔

لیکن جب آریہ ہندوستان میں آئے تو یہاں کی دنیا ایران کی دنیا سے مختلف تھی۔یہاں دراوڑ اور دوسری قوموں کے لوگ آباد تھے جن کی مخصوص تہذیب تھی جن کا مخصوص مذہبی فلسفہ تھا، ساخت کے اعتبار سے مختلف زبان تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ آریائی زبان، آریائی مذہب اور آریائی زندگی سب پر اس اختلاط کا اثر پڑا۔ بعض چیزوں میں یہ اثر کچھ گہرا تھا بعض میں بالکل معمولی۔زبانوں کی ساخت ایک دوسرے سے اتنی الگ تھی کہ وہ زیادہ اثر قبول نہ کر سکیں۔یہاں ان اثرات کے تفصیلی بیان کا موقع نہیں ہے، صرف اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ گو آریوں کے مقابلہ میں ہندوستان کے قدیم بسنے والے ٹھہر نہ سکے اور عام طور سے شمالی ہند کے میدان خالی کر کے جنوب میں چلے گئے لیکن نہ تو سبھوں کا جانا ممکن تھا اور نہ آریہ فاتحوں کے لئے مفید، اس لئے ان میں نسلی اختلاط بھی ہوا۔

آریہ اپنی ایک ترقی یافتہ اور قریب قریب تکمیل کو پہونچی ہوئی زبان لے کر ہندوستان آئے تھے۔یہ بات بحث طلب ہے کہ وہ سب کے سب سنسکرت کی مختلف بولیاں بولتے تھے لیکن جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ ہند آریائی زبان کے اس ابتدائی دور میں سنسکرت کے علاوہ اور پراکرتیں بھی رائج تھیں سنسکرت رگ وید اور دوسرے ویدوں میں زندہ ہے، دوسری پراکرتوں کا ٹھیک پتہ نہیں مختصر یہ کہ اس وقت کی زبانوں میں سنسکرت ہی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

سنسکرت اور پراکرت گریرسن اور بعض دوسرے مصنفوں نے یہ خیال ظاہر

کیا ہے کہ آریہ مختلف گروہوں میں آئے۔ جو پہلے آئے وہ وسطی آریہ ورت (وسطی شمالی ہند) میں بس گئے جو بعد میں آئے انھوں نے بیچ کے علاقہ میں جگہ نہ پاکر ان کے گرد گھیرا ڈال دیا، اس طرح گویا دو طرح کے آریہ شروع ہی سے پائے جاتے ہیں جنھیں ان مصنفین نے "اندرونی" اور "بیرونی" آریہ کہا ہے اور اسی بنیاد پر ان کی بولیوں کو بھی تقسیم کردیا ہے، ان کا خیال ہے کہ "اندرونی آریوں" کی زبان میں قدیم ویدک زبان کی خصوصیتیں بہ نسبت "بیرونی آریوں" کی زبان کے زیادہ پائی جاتی ہیں لیکن عام طور پر اس نظریہ کو اہمیت نہیں دی جاتی کیونکہ اس سے اہم لسانی گتھیاں نہ تو سلجھتی ہیں اور نہ باقاعدہ ہند آریائی کے ارتقاء کی تاریخ مرتب کرنے میں ان سے مدد ملتی ہے بعض دوسرے مصنفین نے مختلف گروہوں کے آریوں کی بولیوں میں اختلاف مانا ہے۔ اس دور کو آسانی کے لیے "ویدک دور" کہا جاتا ہے۔ اس دور کی سب سے اہم زبان سنسکرت ہے جس نے ادبی حیثیت اختیار کرلی تھی باقی دوسری زبانیں پراکرت کہی جاتی تھیں۔ دور حاضر میں پراکرتوں پر جو کام ہوا ہے اور ان کے متعلق جتنی معلومات حاصل کی جاچکی ہیں اُن کی بنا پر ارتقائے لسان کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

خیالات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ سنسکرت ویدک دور کی وہ پراکرت ہے جس نے مذہبی علمی اور ادبی زبان کی حیثیت اختیار (کرلی) جو دوسری پراکرتوں کو حاصل نہ ہو سکی۔ اس طرح سنسکرت خواص کی "تہذیب یافتہ" زبان بن گئی اور پراکرتیں عوام کی "فطری بولیوں" کی حیثیت سے رائج رہیں سنسکرت دنیا کا ایک عظیم الشان تہذیبی سرمایہ بن گئی اور دوسری پراکرتیں کوئی اہمیت حاصل نہ کر سکیں۔

قدیم ترین ڈراموں میں برہمن، بادشاہ، وزراء اور امراء سنسکرت بولتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور عورتیں اور عوام پراکرتیں بولتے ہوئے۔

ہندوستان پہونچ کر آریوں نے اپنے کو ذاتوں میں تقسیم کر دیا اس لیے اوپر اور نیچے کی ذاتوں کی بولیوں میں خلیج وسیع ہوگئی اور وقت کے ساتھ ہوتی چلی گئی۔ سنسکرت کی مذہبی اہمیت نے اُسے مقدس بنا کر اُس کی حد بندیاں کر دیں اور قواعد دانوں اور برہمنوں کی سخت گیری نے اسے عام ہونے سے روک دیا لیکن پراکرتیں وقت کے تقاضوں سے بدلتی رہیں۔ بہت سے لوگ پراکرتوں کو سنسکرت سے ماخوذ سمجھتے ہیں لیکن یہ خیال زیادہ صحیح نہیں ہے بلکہ صرف اس حد تک درست ہے کہ قدیم اور وسطی پراکرتوں اور جدید دور کی زبانوں پر سنسکرت نے زبردست اثر ڈالا۔

پراکرتوں کے تین دور

پراکرتوں کے صوتی اور لسانی تغیرات پر نظر رکھتے ہوئے جدید علمائے لسانیات نے انھیں تین دوروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ (۱) پہلا دور آریوں کے ہندوستان میں آنے سے شروع ہو کر تقریباً بدھ مذہب کی پیدائش کے قریب ختم ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا دور تقریباً مسلمانوں کے آنے کے وقت ختم ہوتا ہے اور (۳) تیسرا جدید دور اُس وقت سے اب تک چل رہا ہے۔ زبانوں کے ارتقا میں تاریخیں صرف قریب قریب ہی بتائی جا سکتی ہیں صحیح تاریخ بتانا ناممکن ہے کیونکہ ارتقا کی رفتار چند دنوں میں متعین نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ان ادوار کو یوں تقسیم کیا ہے:۔

(۱) قدیم ہند آریائی ——— آریوں کی آمد سے لے کر تقریباً ۶۰۰ ق م تک (تقریباً ۹۰۰ سال)

(۲) وسطی ہند آریائی ———— ۶۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک (تقریباً ۱۶۰۰ سال)

(۳) جدید ہند آریائی ———— ۱۰۰۰ء سے موجودہ دور تک (تقریباً ۹۵۰ سال)

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے انھیں ویدی سنسکرت، پراکرت اور بھاشا کے دور بھی کہا ہے۔ وسطی اور جدید ہند آریائی دوروں کے درمیان ہندوستان کی پراکرتوں میں کچھ اور مخصوص قسم کے تغیرات ہوئے لیکن انھیں کسی الگ دور میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ اپ بھرنش کہا جاتا ہے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ ہند آریائی کے ارتقا کی یہ تین بڑی منزلیں ہیں اس لیے تفصیلی مطالعہ کے لیے ان کی صوتی اور لسانی خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ذیلی تقسیمیں بھی کی گئی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سدھیشور ورما نے اپنی مختصر کتاب "آریائی زبانیں" میں قدیم ہند آریائی کو بھی پانچ منزلوں میں تقسیم کیا ہے۔

(الف) ویدک منزل۔ اس میں سنسکرت کا نشو و نما ہوتا ہے اور سنسکرت ایک خاص جماعت یعنی برہمنوں کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ ویدوں میں وہ الفاظ بہت کم ملتے ہیں جن سے اس وقت کی دوسری بولیوں کی صوتی خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکے۔

(ب) پانینی[1] کا زمانہ۔ اس دور میں سنسکرت ہندوستان کے عالموں کی مشترکہ زبان بن گئی تھی

(ج) رزمیہ منزل۔ اس منزل میں جس میں خاص کر مہا بھارت کی تصنیف

---

[1] سنسکرت کا سب سے مشہور قواعد نویس جس کا زمانہ پانچ سو سال قبل مسیح اور ڈھائی سو سال قبل مسیح کے درمیان قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی سنسکرت کی قواعد اشٹ ادھیائے اس موضوع پر سب سے مشہور کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

ہوئی، عام لوگوں کی پراکرتوں سے کثیر التعداد الفاظ سنسکرت میں شامل کئے گئے۔
(ج) دنیوی منزل۔ اس منزل میں سنسکرت ہندوستان کی سرکاری زبان بن گئی اور اس کا تعلق برہمن جماعت سے ٹوٹ گیا۔ خزانۂ الفاظ میں عام لوگوں کی بولیوں سے الفاظ شامل ہو گئے۔
(د) ٹکسالی منزل۔ اس منزل میں سنسکرت صرف و نحو میں قید ہو کر صرف ایک بناوٹی زبان رہ گئی۔

اس طرح سنسکرت ہی کی مختلف منزلیں قدیم ہند آریائی پر چھائی ہوئی ہیں اور دوسری پراکرتوں کا ذکر ضمنی طور پر آتا ہے۔ برہمنوں کے عروج کے زمانے میں سنسکرت نے تہذیب، ادب اور فلسفہ کی غیر معمولی خدمت کی لیکن برہمنی نظام کی سخت گیری نے گوتم بدھ کا عوامی مذہب پیدا کیا۔ اس انقلاب عظیم نے پراکرت کو بھی ایک مقدس زبان کا مرتبہ دلایا۔ جب گوتم بدھ نے اپنے خیالات کی تبلیغ شروع کی تو ان کے بعض شاگردوں نے ان کو مشورہ دیا کہ یہ خیالات مہذب زبان (یعنی سنسکرت) میں قلم بند کر لیے جائیں تو اچھا ہے لیکن بدھ نے انکار کر دیا اور خواص کی زبان کے مقابلہ میں اس علاقہ کے عوام کی زبان کو اہمیت دے کر ہمیشہ کے لیے فلسفۂ لسان میں ایک اہم باب کا اضافہ کر دیا اس طرح وسطی ہند آریائی کی سب سے اہم زبان پالی بن گئی جو بودھی عقیدے اور ادب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے باہر بھی پہونچی اور اب تک علما کے مطالعہ کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ جین مت نے بھی تقریباً اسی زمانے میں ترقی کی اور چند جینی پراکرتوں کا عروج ہوا۔ بودھی اور جینی عوامی تحریکوں نے مقامی بولیوں اور زبانوں کو اٹھا کر اعلیٰ زبانوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ دور بھی طویل ہے اور اپنے ارتقاء کے لحاظ

سے کئی منزلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما نے اسے مختصراً یوں بیان کیا ہے :-

(ا) وسطی ہند آریائی کی ابتدائی منزل جس میں اشوک کے کتبے لکھے گئے اس میں ماگدھی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

(ب) پالی۔ پالی کے لفظی معنی ہیں کتاب کی اصل عبارت؛ بعد میں یہ لفظ کتاب کی اصل عبارت کی زبان کے لیے استعمال ہونے لگا۔

(ج) اردھ ماگدھی (نصف ماگدھی) اس میں سنسکرت اور ماگدھی کا میل ہے اور جین مذہب کی کتابیں اس میں لکھی گئی ہیں۔

(د) دوسری پراکرتیں۔ ان کی تین اہم قسمیں ہیں: اول (۱) سورسینی جو دوآبہ گنگ جمن اور پنجاب کے علاقوں میں بولی جاتی تھی جو بعد میں سورسینی اپ بھرنش میں تبدیل ہو گئی۔ دوئم (۲) ماگدھی جو مشرقی ہند کی بولی تھی، سوئم (۳) مہاراشٹری جو جنوبی ہند میں اور سنسکرت ناٹکوں میں مستعمل تھی۔

(ہ) اپ بھرنش (یعنی افتادہ) یہ عہد حاضر کی ہند آریائی بولیوں کا پیش خیمہ ہیں۔

وسطی ہند آریائی پراکرتوں میں پالی سب سے اہم ہے لیکن اردو ہندی کا مطالعہ کرنے والوں کو سورسینی کا نام ذہن میں رکھنا چاہیئے کیونکہ یہی سورسینی پراکرت کچھ دنوں کے بعد سورسینی اپ بھرنش میں تبدیل ہوئی اور پھر مغربی ہندی اور مشرقی پنجابی کی مختلف شکلوں کی ماں بن گئی جن میں اردو ہندی بھی شامل ہیں۔ یہ شمالی ہند کے وسطی حصہ کی زبان تھی اور سنسکرت سے قریب تھی۔ اس جگہ وسطی ہند آریائی کی دوسری پراکرتوں کا تذکرہ بے محل ہوگا۔ پھر بھی اس قدر جاننا ضروری ہے کہ جو پراکرتیں

اُس وقت رائج تھیں اُن میں سورسینی (یعنی متھرا کے علاقہ کی زبان) کے علاوہ ماگدھی
اردھ ماگدھی، دراچڑی (سندھ کے علاقہ کی زبان) مراٹھی یا مہاراشٹری اور پیشاچی
(کشمیر کے علاقہ کی زبان) کے نام ملتے ہیں بعض قدیم قواعد نویسوں نے اپ بھرنش کو بھی
ایک علاحدہ پراکرت تسلیم کیا ہے اور کچھ علما کا یہ خیال ہے کہ مہاراشٹری کوئی الگ
آزاد زبان نہیں بلکہ سورسینی ہی کا ایک روپ ہے۔ اگر ان پراکرتوں کا مطالعہ تفصیل
سے کیا جائے تو ان کے سنسکرت سے تعلق اور جدید ہند آریائی بھاشاؤں سے تعلق
کا علم ہوگا۔ اس سلسلہ میں اپ بھرنشوں کا مطالعہ سب سے زیادہ الجھنیں پیدا کرتا ہے۔
اپ بھرنشوں کو ہم دورِ تغیر کی بگڑی ہوئی عوامی بولیاں کہہ سکتے ہیں۔ ان کا
پتہ آٹھویں صدی کے قبل ہی سے چلنے لگتا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب ہندو
تمدن میں انتشار پیدا ہوا اور اس کی مرکزی حکومت ختم ہو کر چھوٹی چھوٹی خود مختار
راجپوت ریاستیں قائم ہوگئیں اس وقت وسطی دور کی پراکرتیں بھی متغیر ہوئیں۔ یہ
وہ زمانہ تھا کہ بدھ مذہب کا اثر ختم ہو رہا تھا اور برہمن پھر اپنے فلسفہ کو نیا رنگ
دے کر اپنا اثر قائم کر رہے تھے۔ ابھی کئی صدیاں نہ گذری تھیں کہ نئی قومیں، نئی
تہذیبوں اور مختلف زبانوں کے ساتھ ہندوستان میں آنا شروع ہوگئیں۔ یہ
مسلمان آنے والے برابر آتے رہے اس لیے آٹھویں صدی کے بعد سے کئی صدیاں
نسبتاً انتشار کی صدیاں کہی جا سکتی ہیں جن میں سیاسی حیثیت سے کسی نہ کسی قدر
امن قائم ہوگیا تھا لیکن لسانی اور معاشرتی حیثیت سے اضطراب تھا۔ دو زبردست
تہذیبوں اور مذہبوں کا تصادم اور اختلاط معمولی بات نہ تھی۔ اس زمانے کی پراکرتیں
سیال حالت میں تھیں اور اضطراب و انتشار کے تمام اثر قبول کر رہی تھیں۔

جدید ہند آریائی زبانیں انھیں اپ بھرنشوں سے پیدا ہوئیں۔ اپ بھرنشیں اپنی ابتدائی منزل میں صرف بول چال کی زبانیں تھیں بعد میں ان میں کافی مقدار میں ادب بھی پیدا ہوا۔ بودھ سدھوں اور دوسرے گروہ کے جوگیوں اور فقیروں کی شاعری بھی انھیں اپ بھرنشوں میں تھی۔ ان میں سنسکرت کے "تت سم" الفاظ نہیں پائے جاتے۔ ان کے سلسلہ میں ایک بحث بہت عام ہے، کیا ہر جدید بھاشا کے اوپر کوئی اپ بھرنش تھی یا صرف چند اپ بھرنش بولیاں تھیں جن سے جدید زبانیں پیدا ہوئیں؟ یہ ایک الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ اس پر تھوڑی بہت بحث ڈاکٹر تاراچند نے کی ہے لیکن انھوں نے مختصراً چند اپ بھرنشوں کا ذکر کرکے ایک اپ بھرنش ناگر کو مشرقی اور مغربی میں تقسیم کر دیا اور کئی اہم جدید زبانوں کو انھیں کے ماتحت لے کر دیا لیکن دوسرے مصنفوں نے متعدد اپ بھرنشوں کے نام دیے ہیں جو ارتقار کی منزلیں طے کرکے جدید ہند آریائی زبانیں بن گئیں۔ اپ بھرنشوں میں تصانیف کا سلسلہ تقریباً چودھویں صدی تک ملتا ہے۔ ہندی زبان کے جدید "تاریخ نویسوں" نے اپ بھرنش کو بھی ہندی کے ارتقار کی ابتدائی شکل قرار دے کر اپنی زبان میں شامل کر لیا ہے۔

ہند آریائی کی جدید پراکرتوں کو چٹرجی نے چھ گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ گریرسن کی تقسیم اس سے مختلف ہے۔ چٹرجی نے ان کے بولنے والوں کی تعداد بھی دی ہے۔ کہیں یہ تعداد گریرسن کے جائزے سے دی گئی ہے اور کہیں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے۔ جدید پراکرتوں کی یہ تقسیم سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے:-

(۱) شمالی مغربی گروہ: ———— (۱) ہندکی یا لہندی یا مغربی پنجابی (پچاسی لاکھ)

(۲ سندھی (چالیس لاکھ)

(۲) جنوبی گروہ :۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (۳) مراٹھی (دو کروڑ دس لاکھ) معہ کونکنی

(۳) مشرقی گروہ :۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (۴) اڑیہ (ایک کروڑ دس لاکھ)

(۵) بنگالی (پانچ کروڑ پینتیس لاکھ)

(۶) آسامی (بیس لاکھ) (۷) بہاری بولیاں

یعنی میتھلی، مگھی اور بھوجپوری (تین کروڑ ستر لاکھ)

(۴) مشرقی وسطی گروہ :۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (۸) مشرقی ہندی یعنی کوسالی یا اودھی بگھیلی اور

چھتیس گڑھی (دو کروڑ پچیس لاکھ)

(۵) وسطی گروہ :۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (۹) مغربی ہناری یا ہندی جس میں ہندستانی

کھڑی بولی (ہندی اور اُردو) بانگرو، برج بھاشا

قنوجی اور بندیلی شامل ہیں (چار کروڑ دس لاکھ

(۱۰) پنجابی یا مشرقی پنجابی (ایک کروڑ پچپن لاکھ)

(۱۱) راجستھانی گجراتی جس میں راجستھانی

گجراتی اور بھیلی بولیاں شامل ہیں (دو کروڑ ستر لاکھ)

(۶) شمالی یا پہاڑی گروہ :۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (۱۲) مشرقی پہاڑی یا نیپالی (ساٹھ لاکھ)۔

(۱۳) وسطی پہاڑی مع گڑھوالی و کمایونی (دس لاکھ)

(۱۴) مغربی پہاڑی بولیاں (بیس لاکھ)

ان میں سے بعض زبانیں ایسی ہیں، جن میں ادب پیدا ہوا بعض ایسی ہیں جو ترقی کرکے دنیا کی زبانوں میں اہمیت حاصل کر گئیں بعض محض بولیوں تک محدود رہ گئیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اہم جدید ہند آریائی، بھاشاؤں کا تذکرہ کیا جائے مسلمانوں کے آنے کے بعد جو تہذیبی اختلاط ہوا اس پر نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

تہذیبوں کا اختلاط تہذیب اور باہمی اختلاط کا اثر دو یا دو سے زیادہ ملنے والی قوموں پر اتنی شکلوں میں پڑتا ہے کہ ان کا یقینی علم ناممکن ہے لیکن جن چیزوں کا شمار عام مظاہر تہذیب میں ہوتا ہے ان میں میل جول کا اثر نمایاں ہوجاتا ہے اور تعلقات کی نوعیت اور شدت کے تناسب سے اثرات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ملنے والی قوموں کے سماجی، معاشرتی، تعلیمی، سیاسی اور تمدنی اداروں کا مطالعہ کرنے سے تہذیبی اختلاط کے عناصر سمجھ میں آتے ہیں۔ اختلاط کا سب سے واضح ذریعہ زبان ہوتی ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ سے عمل میں اشتراک اور میل جول میں قرب پیدا ہوتا ہے اس لئے اس کا مطالعہ تمدنی امتزاج کے سمجھنے میں سب سے زیادہ معین ہوتا ہے۔ تہذیبی حیثیت سے فن تعمیر، موسیقی، رقص، مصوری، ادب فلسفہ، رسم و رواج اور مذہب سب ہی اختلاط قومی کا پتہ دیتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ ایسے ہی تہذیبی لین دین سے بھری ہوئی ہے اور کوئی قوم اس کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ باہمی اختلاط کے بعد اثر قبول کرنے سے بچی رہی کیوں کہ ایک دوسرے کے تہذیبی قرضے جو زبان، ادب اور دوسرے تمدنی مظاہر کی شکل میں لیے جاتے ہیں فوراً اس کی غمازی کرتے ہیں۔

[" ہندوستان جس کے دروازے آنے والوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہے۔ تہذیبی یا لسانی یکسانیت کیوں کر برقرار رکھ سکتا تھا لیکن یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ تقریباً چھ ہزار سال کی تاریخ میں مختلف قسم کے تہذیبی عناصر کے باوجود ہندوستانی

کلچر میں ایک مخصوص قسم کی وحدت نظر آتی ہے اور کئی اختلافات کے باوجود اس کی ترکیبی نوعیت آج بھی باقی ہے۔ سنیتی کمار چیٹرجی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں حیوان نے ارتقار کی منزل طے کر کے انسان کی شکل کبھی اختیار نہیں کی بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا انسانوں کے روپ میں یہاں پہلے پہل نیگرائڈ آئے، پھر پروٹو آسٹرالائڈ، اس کے بعد آسٹرک، پھر دراوڑ، پھر آریہ، آریوں کے بعد منگول نسل کے لوگ، یہ سب مل جل کر ایک نئی تہذیبی وحدت میں گم ہو گئے اور چھوٹے چھوٹے اختلافات کے باوجود ایک دوسرے میں گھل مل گئے۔ یا جغرافیائی حد بندیوں کی وجہ سے کامل علیحدگی رہی (لسانی حیثیت سے یہ اختلاط مکمل نہ ہو سکا) لیکن اختلاط کی یہ کہانی یہیں نہیں ختم ہو جاتی بلکہ اس کے بعد بھی یونانی، سناک، ہن اور دوسری قوموں کے لوگ وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ ان آخر الذکر قوموں نے تو ہندوستان کی تہذیب پر بہت ہی معمولی اثر چھوڑا کیونکہ ان کا اختلاط وقتی تھا۔ اگر واقعی دیکھا جائے تو اس سلسلہ میں دراوڑوں کے بعد آریہ تمدن آریہ ورت پہ چھا گیا۔ اس میں اگر کچھ تغیر ہوا تو مسلمانوں کے آنے سے، جو یہاں آ کر بس گئے، اسی زمین کا جزو بن گئے اور اسی ملک کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا گویا اُن کی حیثیت کبھی غیر ملکیوں کی نہیں رہی کیونکہ اگر اس نظر سے دیکھیں تو پھر دراوڑ اور آریہ بھی غیر ملکی کہے جا سکتے ہیں (بعد میں تمدنی حیثیت سے انگریزی اثر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن اس جگہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں)

مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا تاریخ کا عظیم الشان واقعہ ہے اس کی مفصل تاریخ یا اُن کے آنے سے ہندوستانی زندگی پر جو اثرات پڑے ان کا

مفصل ذکر یہاں ناممکن ہے بس کڑیوں کو جوڑنے کے لیے صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کیا جائے گا جن سے جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کے سمجھنے میں مدد مل سکے اور چونکہ زبانوں کا یہ ارتقا عام تمدنی ترقی کا ایک جز و ہے اس لیے ضمناً اس کا ذکر بھی کہیں کہیں آئے گا

ظہور اسلام سے قبل عرب کے تاجر ہندوستان سے تجارت کرتے تھے۔ عام طور سے وہ مالابار کے ساحل پر اترتے اور جنوبی ہند میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب اسلام ساتویں صدی عیسوی میں ایک نئی انقلابی قوت کی حیثیت سے عرب میں رونما ہوا۔ اب وہ تاجر اسلام قبول کر کے زندگی کے ایک نئے دائرے میں داخل ہو گئے اور یہاں کے ساتھ مذہب کی تبلیغ بھی کسی نہ کسی عنوان سے کرنے لگے۔ ان تاجروں نے چند صدیوں میں جنوبی ہند کی زندگی پر کیا اثر ڈالا اس کی ایک طویل کہانی ہے لیکن لسانی حیثیت سے ان کا اثر زیادہ گہرا نہ تھا کیونکہ تعلقات تمدنی نہ تھے بلکہ زیادہ تر تجارتی تھے (تہذیبی نقطۂ نظر سے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں بھگتی کی تحریک جنوبی ہند ہی میں شروع ہوئی اور گیارھویں اور بارھویں صدی صدی تک رامانج اور شنکر آچاریہ کے ہاتھوں میں پہونچ کر ہند و فلسفہ کی بنیاد بن گئی۔ اس میں اسلامی تصورات کے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ گو بودھی طرز فکر کے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پھر کئی معمولی حملے ہوئے جن کی کوئی اہمیت نہیں لیکن ۷۱۲ء میں مسلمانوں نے سندھ اور جنوبی پنجاب کو فتح کر لیا، کچھ لوگ وہیں رہ گئے، ان کا اثر سندھی زبان اور رسم خط پر اب تک موجود ہے لیکن یہ حملہ بھی واقعہ کی ایک ایسی کڑی ہے جو ہند آریائی

کے ارتقا پر کوئی بنیادی اثر نہیں چھوڑا کیونکہ مسلمان ہندوستان کے صرف ایک گوشے کو متاثر کر کے رہ گئے تھے۔

دسویں صدی کے آخر میں مسلمان شمال و مغرب سے آئے۔ اس وقت تک ان کو ایران میں دو صدیاں گذر چکی تھیں۔ وہاں انھوں نے ایک ایسے تمدن کی بنیاد ڈال دی تھی جس میں سامی مذہب (اسلام) کے ساتھ ساتھ ایرانی (عجمی) کلچر کی بھی آمیزش تھی۔ خود اس ایرانی کلچر میں زردشتی ثنویت، بودھی بے تعلقی اور مسیحی رہبانیت کے اثرات ملے ہیں۔ آنے والوں کی زبانیں ویسے تو مختلف تھیں لیکن عام طور سے وہ لوگ فارسی سے اپنا کام چلاتے تھے (جسے لسانیات کی کتابوں میں جدید فارسی کہا گیا ہے) اس میں عربی کا اثر بھی کافی تھا۔ جدید ہند آریائی کے ارتقا کے سلسلے میں ان تمام عناصر پر نگاہ رکھنے ہی سے بہت سی باتیں سمجھ میں آسکیں گی۔ یوں تو مسلمانوں کے اس طرح آنے کا سلسلہ سنہ ۹۸۷ء سے شروع ہو کر کسی نہ کسی شکل میں سنہ ۱۷۶۱ء تک جاری رہا لیکن لسانی ارتقا کے نقطۂ نظر سے بعد کے زمانے کا مطالعہ اتنا ضروری نہیں جتنا کہ شروع کا ہے کیونکہ جدید ہند آریائی زبانوں کی تشکیل چودھویں پندرھویں صدی تک ہو چکی تھی گو ان میں ادب بعد میں پیدا ہوا۔

آسانی کے لئے پہلے ان تاریخی حقائق کا جائزہ لینا مناسب ہوگا جن کا لسانی ارتقا سے تعلق ہے۔ اس کے بعد ان کا تجزیہ کر کے نتائج نکالنے میں آسانی ہوگی۔

سنہ چھٹی صدی عیسوی کے بعد سے ہندوستان چھوٹی چھوٹی راجپوت ریاستوں میں بٹ گیا تھا یہ حالت محمود غزنوی کے حملوں کے وقت تک قائم رہی۔ یہ حملے سنہ ۱۰۰۰ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۰۲۶ء تک جاری رہے اور گو محمود نے کانگڑا اور بنارس تک حملے

گیے لیکن جب اس کا انتقال ہوا تو غزنوی سلطنت کا دائرہ صرف پنجاب تک محدود تھا۔ غزنوی حکومت پنجاب میں تقریباً پونے دوسو سال تک قائم رہی سنہ ۱۱۹۱-۹۲ء میں محمد غوری نے پرتھوی راج کو شکست دے کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔ محمد غوری کے مرنے کے بعد سنہ ۱۲۰۶ء میں اس کے ایک غلام قطب الدین ایبک نے دہلی میں غلام خاندان کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت تقریباً تیرھویں صدی عیسوی کے آخر تک قائم رہی۔ اس درمیان میں وسط ایشیا میں چنگیز خاں کے خوف سے لوگ ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ بہت سے ایرانی بھی ہندوستان میں آ گئے۔ اس کے بعد خلجیوں کی حکومت شروع ہوئی۔ بنگال تو غلاموں ہی کے زمانے میں فتح ہو چکا تھا۔ علاءالدین خلجی نے دکنی ہندوستان کو بھی سنہ ۱۳۱۶ء میں فتح کر لیا۔ اس کے مشہور سپہ سالار ملک کافور نے شمالی اور جنوبی ہند کو ایک کر دیا۔ سنہ ۱۳۲۰ء میں غیاث الدین تغلق نے تخت حکومت پر قدم رکھے، اس کے پانچ سال بعد محمد تغلق بادشاہ ہوا۔ اس کا شمار غیر معمولی بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کی ذہانت میں جلد بازی ملی ہوئی تھی چنانچہ تخت حکومت پر بیٹھتے ہی اس نے حکم دیا کہ دارالحکومت دہلی سے ہٹا کر دیوگیر (دولت آباد واقع دکن) کر دیا جائے، ساری فوج رعایا، پیشہ ور، تاجر، امرا اور فقرا جبراً دیوگیر بھیجے گئے اور جب دوبارہ غور کرنے پر یہ حکم غلط معلوم ہوا تو دوسرے سال سب کو دہلی واپس آنے کا حکم دیا گیا۔ بہت سے لوگ دیوگیر ہی میں رہ پڑے۔ تغلق حکومت کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان کے ہر گوشے میں بدامنی پھیل گئی۔ بنگال، جون پور، دکن، مالوہ، گجرات سب آہستہ آہستہ خود مختار ہو گئے۔ اور ہر ایک نے علوم و فنون کی سرپرستی میں مرکزی حکومت کا مقابلہ کیا۔ سنہ ۱۳۹۸ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور نصف صدی کے لیئے

سید خاندان کو دہلی کے تخت پر بٹھا گیا۔ اس کے بعد بہلول لودھی نے دہلی میں ایک مضبوط حکومت قائم کی اور اس کے جانشینوں نے سنہ ۱۵۲۶ء تک حکومت کی۔ اسی درمیان میں فرید خاں (شیر شاہ سوری) نے افغانوں کو متحد کرنا شروع کر دیا تھا لیکن بابر نے آخری لودی بادشاہ کو شکست دے کر ہندوستان میں مغل حکومت قائم کر دی۔

مغل حکومت سے تاریخ ہند کا ایک اہم باب شروع ہوتا ہے اس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھنا چاہئے۔ ان مغلوں کی زبان ترکی تھی اور یہ ایرانی تمدن سے متاثر تھے۔ بابر کی چار سالہ حکومت کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اسے شیر شاہ نے شکست دے کر ایران بھگا دیا۔ اور سوری خاندان نے پندرہ سال دہلی میں حکومت کی سنہ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں واپس آیا لیکن دو ہی سال کے اندر وہ اپنے تیرہ سال کے بیٹے اکبر کے لیے تخت حکومت چھوڑ کر مر گیا۔ اکبر نے ہندوستان پر تقریباً پچاس سال حکومت کی اور اپنے طور پر ایک مستحکم مرکزی قومی حکومت بنائی۔ اس نے دکن کے کچھ حصوں پر بھی قبضہ کر لیا اور بنگال، جونپور، مالوہ، گجرات ہر ایک کو مغل سلطنت کا جزو بنا لیا۔ اکبر نے سنہ ۱۶۰۵ء میں انتقال کیا۔ جہانگیر نے بائیس سال حکومت کی۔ شاہ جہاں کا زمانہ مغل حکومت کا سنہرا زمانہ کہا جاتا ہے، اس نے مغلوں کی شان و شکوہ میں اضافہ کیا لیکن اس کا نقطۂ نظر وہ نہ تھا جو اکبر و جہانگیر کا رہ چکا تھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے تقریباً ساٹھ سال حکومت کر کے سنہ ۱۷۰۷ء میں انتقال کیا۔ اس نے دکن کے باقی حصے کو بھی (سنہ ۱۶۸۶-۸۷ء میں) اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد سے مغل حکومت کا زوال شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ دہلی کی مرکزیت ختم ہونے لگتی ہے۔ دور دراز کے علاقے خود مختار ہو جاتے ہیں، مرہٹوں، سکھوں اور

انگریزوں کا عروج ہوتا ہے۔

مختصر ترین لفظوں میں یہ تاریخ کے ان ادوار کا خاکہ ہے جن میں جدید ہند آریائی زبانوں کی تشکیل عمل میں آئی۔ ان متعدد صدیوں میں تہذیبی اختلاط کی کیا مختلف نوعیتیں رہیں، زمان و مکان میں اس اشتراک کی جڑیں کتنی گہری پیوست ہوئیں اس کا پتہ زندگی کے ہر شعبے سے چلتا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں لیکن اشارے ضروری ہیں کیونکہ ان کو سمجھے بغیر لسانی ارتقا کی ماہیت اور نوعیت کا سمجھنا دشوار ہو جائے گا۔

اگر ہم مسلمان قوموں کی ساحل مالابار سندھ کی فتوحات کو نظرانداز کر دیں تو ہماری موجودہ بحث کے مطالعہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ مسلمانوں نے پنجاب میں پہلے پہل غزنویوں کے زمانے میں باقاعدہ قیام کیا۔ غزنویوں کی پونے دوسو سال کی حکومت محض جابرانہ حکومت نہیں تھی بلکہ اس زمانے میں تہذیبی لین دین بھی ہوا۔ محمود اور اس کے خاندان کے لوگ علم دوست تھے اور ابوریحان بیرونی (۹۷۳ء سے ۱۰۳۸ء تک) کے حوالے سے یہ بات کئی مورخوں نے لکھی ہے کہ اس عہد میں کئی یونانی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی اور عربی میں ہوئے۔ غزنوی فوجوں میں ہندو سپہ سالار ملازم تھے۔ اور تمام رعایا کے ساتھ رواداری کا برتاؤ ہوتا تھا۔ فارسی کے مستند شعرا کے یہاں ایک آدھ ہندوستانی لفظ بھی نظر آتے ہیں اور یہی نہیں محمد عوفی (لباب الالباب میں) اور امیر خسرو (دیباچہ غرۃ الکمال میں) نے مسعود ابن سعد سلمان کو فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی کا شاعر بھی بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ہندی سے مراد ہندوستان کی وہ زبان ہے جو اس علاقہ میں بولی جاتی رہی ہوگی۔ خیال ہے کہ اس وقت پنجاب میں سورسینی اپ بھرنش کی کوئی شکل رائج رہی ہوگی۔ اتنی

تھوڑی مدت میں یہ تہذیبی تعلق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ محمد غوری کے زمانے میں یعنی بارھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کے تعلقات کی حدیں وسیع ہو گئی تھیں لیکن لسانی اختلاط کی شہادتیں اتنی کم ہیں کہ جنھیں بنیاد بنا کر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ بیسل دیو راسو اور پرتھی راج راسو[۱] میں جو عربی فارسی الفاظ ملتے ہیں ان کی صحت کسی قدر مشکوک ہے لیکن محل، انعام، سلطان، پیغام وغیرہ جیسی سماجی نوعیت کے الفاظ ہیں ان کا ہندوستانی شعرا کے قلم سے نکلنا تعجب خیز نہیں ہے۔ پرتھی راج راسو کی زبان ایسی ملی جلی ہے کہ اسے کسی مخصوص زبان کے ماتحت رکھنا آسان نہیں وہ ہندی کی ایسی شکل ہے جو راجستھانی سے قریب ہے۔ اس میں اپ بھرنش کا انداز بھی پایا جاتا ہے اور سنسکرت، عربی فارسی کے لفظ بھی ملتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ مسلمان دہلی کے تخت حکومت پر آئے۔ انھیں ملکی اور فوجی ضروریات کے لیے اس علاقے کی زبان استعمال کیے بغیر چارہ نہ رہا ہوگا لیکن تحریری شہادتوں کی عدم موجودگی میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔

آگے بڑھنے سے قبل ایک لسانیاتی اصول کا بیان کر دینا ضروری ہے۔ تاکہ شہادتوں کی عدم موجودگی میں کم سے کم کسی قابل اطمینان قیاس سے تو کام لیا جا سکے۔ ایک زبان دوسرے لسانی علاقے میں اپنے بولنے والوں کے ساتھ کئی طرح پہونچ سکتی ہے۔ ایک قوم کا دوسری قوم پر فتح حاصل کرنا اس اختلاط کی سب سے واضح شکل ہے اور دنیا کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی

---

[۱] بیسل دیو راسو مصنفہ نرپتی نلھا اور پرتھی راج راسو مصنفہ چند بردائی ابتدائی ہندی ادب کی اہم ترین کتابیں ہیں۔ دونوں بارھویں صدی کی کتابیں ہیں۔ ان کے بعض حصوں کی قدامت مشکوک ہے۔

ہے جیسپرسن[1] نے ایک محقق لسانیات جارج ہمپل کی تحقیقات کا خلاصہ دیا ہے اس کا مطالعہ ہندوستان کی لسانی گتھی کے سمجھنے میں بھی معین ہوگا۔

عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ فاتح ایک چھوٹی جماعت میں کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں اور گو وہی حاکم ہوتے ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی نہیں ہوتی کہ وہ ملک کو اپنی زبان بولنے پر مجبور کر سکیں۔ بلکہ انھیں خود اس مفتوح ملک کی زبان بولنے پر مجبور رہونا پڑتا ہے۔ دو ہی نسلوں کے اندر ایسا ہو سکتا ہے کہ فاتح قوم اپنی زبان چھوڑ کر اس ملک کی زبان اختیار کرے۔ ایک مدت گذر جانے کے بعد فاتح قوم کی زبان ختم ہو سکتی ہے لیکن مفتوح قوم کی زبان میں حکومت، فوج اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے الفاظ کا ایک ذخیرہ چھوڑ جاتی ہے۔ اگر فاتح ملک پڑوس ہی کا ملک ہے تو ان تعلقات کی تجدید بھی ہوتی رہتی ہے اور یہ اثر دیرپا ہو جاتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حملہ آور بڑی تعداد میں آتے ہیں، اپنے ساتھ زندگی کی ضروریات اور لوگ لے کر جا کر لاتے ہیں مفتوح قوم کے لوگ دور ہٹ جاتے ہیں اور اختلاط گہرا نہیں ہوتا۔ فاتح قوم کے اوپری طبقے میں مفتوح قوم کی زبان کمینوں اور معمولی لوگوں کی زبان سمجھی جاتی ہے مشکل سے ان کے کچھ لفظ فاتح قوم کی زبان میں داخل ہوتے ہیں اس کے علاوہ تاجر اور قلی کی حیثیت سے بھی ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ جا کر آباد ہوتے ہیں اور اسی جگہ کی زبان استعمال کرنے لگتے ہیں۔

یہ خیالات بہت اہم ہیں کیوں کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کا ایک سیاسی

---

[1] LANGUAGE, ITS NATURE, DEVELOPMENT AND ORIGIN

پہلو بھی ہے جو معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر اثر انداز ہوا اور جس نے یہاں کے لسانی ارتقا کو ایک مخصوص شکل میں متاثر کیا۔ مسلمان بادشاہوں نے یہاں اسلامی حکومت قائم نہیں کی بلکہ بادشاہتیں قائم کیں۔ وہ اپنی توسیع سلطنت کے لیے صرف ہندوؤں سے نہیں لڑے بلکہ مسلمان قوموں اور بادشاہوں سے بھی لڑے۔ اپنی حکومت کے استحکام میں دونوں سے مدد لی۔ انھوں نے مذہب پھیلانے کے لیے کوئی شعبہ قائم نہیں کیا بلکہ وہ جس قسم کے شاہی نظام سے تعلق رکھتے تھے اس میں انھوں نے وہی طبقاتی نظام برقرار رکھا جو ہندوستان میں موجود تھا۔ یہیں کے نظام مملکت کو کہیں حیثیتوں سے قائم رکھنے کی کوشش کی۔ بس خاص فرق یہ تھا کہ انھوں نے شاہانہ شکوہ اور مرکز کے استحکام پر بہت زور دیا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ کہیں دور بیٹھ کر حکومت نہیں کر رہے تھے بلکہ اسی ملک میں رہ کر یہاں کی زندگی میں ڈوب کر، یہاں کی آب و ہوا میں نشوونما پاکر یہیں کے خمیر سے پیدا ہو کر اور یہیں کی مٹی میں دفن ہو کر وہ یہیں کے ہو گئے تھے تہذیبی اختلاط زندگی کے ہر شعبے میں ہو رہا تھا اور جتنا زمانہ گذرتا جا رہا تھا باہر سے آئے ہوئے لوگ ہندوستانی طرزِ زندگی، رسم و رواج اور روایات و توہمات میں شریک ہوتے جا رہے تھے۔

حملوں اور جنگوں کی پہلی لہر جس نے منافرت پیدا کی تھی جب بیٹھی تو دلوں میں میل اور محبت کے سوتے پھوٹے جنھوں نے نہ صرف مختلف فنونِ لطیفہ میں بلکہ مذہب میں بھی ایک دوسرے کو قریب کر دیا۔ بھگتی کی ویشنوی تحریک، جو برہمنوں کے جامد نظامِ زندگی کے خلاف ردِعمل کے طور پر اور بدھ مت کے اثر سے جنوبی ہند میں شروع ہوئی تھی ایک اہم فلسفیانہ تحریک بن گئی تھی اس میں مسلمانوں کے تصورات کا اثر بھی نمایاں

ہے بعض مورخوں کا خیال ہے کہ یہ اثر جنوب میں مسلمانوں کے ابتدائی تعلقات ہی کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ بعض اسے بعد کی چیز سمجھتے ہیں جو کچھ بھی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس پر مسلمانوں کے قیام ہندوستان کا گہرا اثر پڑا اور یوں ہندوؤں مسلمانوں کے میل جول میں صرف مادی اور خارجی صورتوں کا مطالعہ ہم کو کسی نتیجہ تک نہ پہونچائے گا بلکہ اشتراک کے جو باطنی اور روحانی پہلو پیدا ہوگئے تھے وہ بھی اہم ہیں۔ ہمارے پیش نظر اس وقت صرف اس اختلاط کے لسانی پہلوؤں کا مطالعہ ہے اس میں بھی اس مذہبی اختلاط کا اتنا ہاتھ ہے کہ اس کا تذکرہ چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو ناگزیر ہے لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے ہند آریائی کے ارتقا کی اس کہانی کی طرف پلٹ جانا چاہیئے جو ادھوری رہ گئی ہے۔

جدید پراکرتوں کا ارتقا

اپ بھرنشوں نے نکھر کر جدید ہند آریائی پراکرتوں کی شکل اختیار کی لیکن وسطی دور سے جدید دور میں داخل ہونے ہوتے پانچ سو سال سے زیادہ صرف ہوگئے۔ جن عناصر نے ان میں مدد دی ان کا ذکر آگے آچکا لیکن ان کے علاوہ اور بھی اسباب تھے جن کا تعلق اس وقت کی عوامی مذہبی تحریکوں، مضبوط حکومت کے قیام اور وسائل آمد و رفت کی آسانیوں سے ہے، ہندوستانی زندگی میں نئے عناصر کے داخل ہو جانے کی وجہ سے یہاں کی زبانوں کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ نئے حالات کے مطابق بننے کے لیے اپنے اندر اہم صوتی اور لسانی تغیرات کو جگہ دیں۔ ڈاکٹر چٹرجی کا خیال ہے کہ اگر مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات نہ حاصل کی ہوتیں تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں پیدا ہوتیں لیکن انھیں جو سنجیدہ ادبی حیثیت حاصل ہوگئی اس میں ضرور دیر

ہوتی (انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۹۸)

پراکرتوں کے ادوار کا تذکرہ کرتے ہوئے جدید ہند آریائی کی مخصوص زبانوں کے نام اور ان کے بولنے والوں کی تعداد دے دی گئی ہے۔ ان میں سے بعض آج بھی اہمیت رکھتی ہیں گو ان کے اصل ارتقا کا زمانہ وہی ہے جس کا تذکرہ ابھی کیا گیا ہے اگر ان میں سے ایک ایک کو لے کر تفصیلی تجزیہ کیا جائے تو اس مقدمہ کے دامن میں نہ سمائے گا مگر اشارے ضروری ہیں کیوں کہ قومی زبان کا مسئلہ سمجھنے میں اس سے مدد ملے گی۔

مغربی پنجابی جسے لہانڈی اور ہندکی بھی کہتے ہیں کوئی مخصوص ادبی حیثیت کبھی نہ حاصل کر سکی، اب تو وہ میدان سے ہٹتی بھی جا رہی ہے اور اس کی جگہ اردو لے رہی ہے۔ سندھی کے پاس کوئی مخصوص ادبی سرمایہ نہیں ہے لیکن نئے سیاسی حالات میں اسے سندھ کے صوبہ کی قومی زبان کہا جا رہا ہے۔ پندرھویں صدی کے قریب صوفیوں اور فقیروں نے اسے ادبی حیثیت دی۔ اس کی کئی بولیاں ہیں۔ مراٹھی نے تیرھویں صدی ہی سے ادب پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس صدی کے آخر میں نام دیو اور گیان دیو کے نام ملتے ہیں جنھوں نے ویشنوی تحریک کو اپنے اشعار سے پھیلایا پھر سولھویں اور سترھویں صدی میں سری دھر اور ٹکا رام گذرے جو اب بھی مراٹھی ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ مراٹھی ادب آج بھی ترقی کر رہا ہے۔ اڑیہ میں سنسکرت کی بھرمار ہے۔ اس زبان میں بھی ادب پندرھویں صدی کے بعد پیدا ہوا، بنگالی ہندوستان کی مشہور ترین زبانوں میں سے ہے۔ اس کے ادب کی ابتدا بھی کرشن بھگتی کے مبلغ چیتنیہ کی مرہون منت ہے۔ ودیاپتی کو بنگالی اور میتھلی دونوں

زبانیں اپنا بنانا چاہتی ہیں اُس کا زمانہ پندرھویں صدی ہے۔ بنگال کے مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں جو ترجمے ہوئے ان کے اثر سے بنگالی میں فارسی عربی الفاظ بھی شامل ہو گئے۔ آسامی پر بنگالی اور بہاری بولیوں کا اثر ہے۔ اس میں بھی ادب کا ذخیرہ معمولی ہے۔ بہاری بولیوں میں سے ہر ایک بہت پرانی ہے لیکن ہر ایک پر ہندی کا گہرا اثر ہے۔ بنگال اور بہار کے سرحدی حصے پر بنگالی کا اثر ہے جدید پراکرتوں کے ابتدائی دور میں ان میں بھی ادب پیدا ہوا۔ اب ان کی حیثیت صرف بولیوں کی ہے۔ مشرقی ہندی کی بولیوں میں اودھی سب سے اہم ہے، یہ اردھ ماگدھی سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔ جون پور کے مشرقی بادشاہوں کے زمانے میں اس کا عروج ہوا۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں اس میں ایسا ادبی ذخیرہ جمع ہو گیا جو ہندوستانی زبانوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ کبیر داس، قطبن، ملک محمد جائسی اور تلسی داس اسی زبان کے رتن ہیں، ادبی حیثیت سے اس کی جگہ اردو اور ہندی نے لے لی ہے اور اودھی صرف بول چال کی زبان رہ گئی ہے۔ مغربی ہندی زبانوں کا ایک بڑا گروہ ہے جس میں آج ہندستانی (اردو ہندی) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، ویسے برج بھاشا، بانگرو، کھڑی بولی، قنوجی اور بندیلی اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بانگرو اور کھڑی بولی کو اردو ہندی کی وجہ سے جانا جاتا ہے ورنہ یہ محض مغربی یو۔پی، دہلی اور مشرقی پنجاب کے بعض اضلاع کی بولیاں تھیں۔ قنوجی اور بندیلی میں معمولی ادب پیدا ہوا تھا۔ برج بھاشا کے ابتدائی ادب کا پتہ نہیں۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں، جب کرشن بھگتی کی تحریک برج کے علاقے میں عام ہوئی تو برج بھاشا کی شاعری نے اسے ملک کے گوشے گوشے میں پہونچا دیا۔ میرا بائی

سورداس، رس کھان، خانِ خاناں کی شاعری میں یہ زبان اپنی حسین ترین شکل میں ملتی ہے۔ برج بھاشا نے مغلوں کے زمانے میں (اور خاص کر آگرہ کے دارالخلافہ بن جانے کی وجہ سے) اتنی اہمیت اختیار کرلی کہ بہت دنوں تک ہندی شاعری کی یہی زبان رہی۔ اب اس کی جگہ بھی ہندی اردو کا رواج ہے۔ پنجابی یا مشرقی پنجابی بھی سورسینی اپ بھرنش ہی کی ایک شکل ہے۔ اس میں ادب کی بہت کمی ہے گرونانک اور دوسرے صوفی شعرا کے کلام میں اس کے نمونے ملتے ہیں، اب اس کی ادبی اہمیت بھی اردو کے نیچے دب گئی ہے۔ راجستھانی بہت سی بولیوں کا مجموعہ ہے۔ جدید ہند آریائی کے ابتدائی دور ہی میں اس نے ادب پیدا کیا۔ قدیم ہندی کی رزمیہ شاعری کا بڑا حصہ اسی کی مختلف بولیوں میں ملتا ہے، آج اس کی جگہ بھی جدید ہندی نے لے لی ہے۔ گجراتی، راجستھانی سے بہت قریب ہے۔ پندرھویں صدی میں نرسنگھ مہتا نے اسے ادبی اہمیت بخشی مسلمانوں کے اثر سے سولھویں سترھویں صدی میں گجراتی میں فارسی اور کھڑی بولی کے اثرات داخل ہوئے۔ ہر دور میں گجراتی ادب نے ترقی کی ہے، آج بھی وہ ملک کی اہم زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ پہاڑی بولیاں اعلیٰ ادب سے خالی ہیں اور آج جدید ہندی کے لئے جگہ چھوڑ رہی ہیں۔

یہ جدید ہند آریائی زبانوں کا ایک بہت ہی نامکمل خاکہ ہے جس سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان میں مراٹھی، اڑیہ، آسامی، بنگالی، گجراتی اور سندھی کو چھوڑ کر باقی زبانیں، اردو، جدید ہندی اور ہندستانی کے سامنے پسپا ہوتی جارہی ہیں گو ان میں سے بعض میں ادب پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے یہ بہت کچھ

ہندوستان کے سیاسی حالات اور تہذیبی ارتقاء کے تصوّر پر منحصر ہے کہ علاقہ جاتی زبانوں اور بولیوں کی ترقی کس حد تک ہو گی یا تعلیم کے ذریعہ سے ہندی کہاں تک اپنے لیئے جگہ بنا سکے گی۔

کھڑی بولی اور اردو

متذکرہ بالا جدید ہند آریائی زبانوں پر نظر ڈالی جائے تو کھڑی بولی کی کوئی اہمیت نہیں معلوم ہوتی یہی نہیں بلکہ قدیم کتابوں میں اس کا نام بھی نہیں ملتا سینتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ چونکہ کھڑی بولی کا تعلق مسلمان بادشاہوں کے دربار سے ہو گیا تھا اس لیئے اسے کھڑی بولی کہا گیا۔ اس علاقہ کی دوسری زبانیں یعنی برج بھاشا وغیرہ پڑی بولیاں کہی جاتی تھیں مگر یہ محض قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ برج بھاشا کی نرم بولی کے مقابلہ میں لوگوں نے اسے (لہجہ اور آوازوں کی درشتی کے لحاظ سے) کھڑی یا کھری بولی کہا ہو یا ابرائیوں نے یہ نام دیا ہو۔ بہرحال کھڑی بولی دلّی اور مغربی یوپی کے عوام کی بولی تھی پنجابی میں فارسی عربی الفاظ کی آمیزش ہو رہی تھی جب دہلی میں دارالسلطنت قائم ہوا تو یہ اثر اور آگے بڑھا۔ اپ بھرنشیں خود بھی جدید ہند آریائی پراکرتوں کا ڈھانچہ تیار کر رہی تھیں۔ کھڑی بولی میں عربی، فارسی آوازوں کے داخل ہونے سے ایک ایسا صوتی نظام بن رہا تھا جس میں فارسی لہجہ اور تلفظ کی کھپت بھی ہو سکے۔ اس طرح کھڑی بولی جو ادبی حیثیت سے بالکل تہی دامن تھی اور صرف بول چال کی زبان ہونے کے لحاظ سے ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود تھی، نئے لسانی عناصر جذب کر کے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

فارسی بولنے والے مسلمانوں نے پہلے پہل پنجاب میں سکونت اختیار کی اور

یقیناً انھوں نے پنجابی بولی اختیار کی ہوگی جسے امیر خسرو نے لاہوری اور ابوالفضل نے ملتانی کہا ہے اور جب وہ دہلی کی طرف بڑھے تو انھیں پنجابی سے کسی قدر ملتی جلتی نئی بولیوں سے سابقہ پڑا۔ یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ دو سو سال کی مدت زبان بننے کے لئے کافی نہیں ہوتی لیکن ایک مخلوط زبان کے خط و خال ضرور ابھر سکتے ہیں چنانچہ ابتدائی اردو (یا مخلوط زبان) میں پنجابی کی کافی آمیزش نظر آتی ہے لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ خود پنجابی اور بالخصوص مشرقی پنجابی اسی اپ بھرنش سے تعلق رکھتی تھی جس سے مغربی یو۔پی کی بولیاں، اس لیے ان میں فرق ہونے کے باوجود بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ دہلی ایک ایسی مرکزی جگہ تھی جہاں کئی زبانیں ملتی تھیں۔ پنجابی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا سب اسی علاقہ سے قریب تھیں۔ برج بھاشا عام طور سے ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی گو اس کے ادب کا پتہ بہت بعد میں چلتا ہے۔ گریرسن نے البتہ لکھا ہے کہ پرتھی راج راسو قدیم برج بھاشا میں لکھی گئی لیکن یہ عام خیال نہیں ہے۔ شروع میں مسلمان اس ادبی زبان کے بجائے بولیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ تھیں پنجابی ہریانی یا بانگرو اور کھڑی بولی۔ چٹرجی نے صاف لکھا ہے کہ ان زبانوں کی قواعدی ساخت میں بہت معمولی فرق ہے اور آج سے آٹھ نو سو سال پہلے تو اور کم فرق رہا ہوگا اس لیے جس نئی زبان کا ڈھانچہ عربی فارسی الفاظ اور آوازوں کے اختلاط سے بن رہا تھا اس میں پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی ہر ایک کو شریک سمجھنا چاہیے۔ جیولز بلاک (فرانسیسی ماہر لسانیات) نے جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے اور جو چٹرجی کے یہاں بھی ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا۔ بعد میں ایک بولی پنجابی بن گئی دوسری کھڑی بولی۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا

کہ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان کا نے کا مشترک سرچشمہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں دونوں کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن چونکہ دہلی مدتوں صدر مقام رہا اس لیے اردو کا تعلق کھڑی بولی سے زیادہ ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی نے اس بات پر بہت زیادہ زور دیا ہے کہ اردو کی ابتدا پنجاب سے اور اس کی ابتدائی ساخت پنجابی سے متعلق تسلیم کرلی جائے لیکن دشواری یہ ہے کہ اول تو خود پنجابی کے تشکیل پانے کا وہی زمانہ ہے، دوسرے یہ کہ دہلی میں خود لاہوری سے مختلف ایک بول چال کی زبان تھی جسے امیر خسرو نے دہلوی کہا ہے، اس لیے اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دہلی کے نواح کی بولیوں میں جس نئی بولی کا نشوونما ہوا وہ اپنی الگ حیثیت رکھتی تھی اور پنجابی سے بہت سی مماثلتیں رکھنے کے باوجود محض اس کا تسلسل یا روپ یا نتیجہ نہیں تھی اور نہ اس کی ابتدا غلاموں کے عہد میں پنجابی مسلمانوں کے دہلی آنے کے بعد ہوئی۔

حال ہی میں پروفیسر شوکت سبزواری نے اپنی کتاب "اردو زبان کا ارتقا" میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ اردو کی ابتدا کا سراغ پالی میں تلاش کرنا چاہیے کیونکہ قواعدی ساخت کے اعتبار سے اردو سب سے زیادہ اسی سے مماثلت رکھتی ہے لیکن یہ بہت بحث طلب مسئلہ ہے اور ابھی اس کے تسلیم کیے جانے کے لیے کافی مواد فراہم نہیں ہوا ہے۔

ابتدائی تحریری مواد کے کم ہونے کی وجہ سے قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے لیکن جیول بلاک نے جو بات کہی ہے وہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس سے اس

یقیناً یہ تو بھی نقصان نہیں پہونچتا کہ اُردو کی ابتدائی ہیئت ترکیبی میں پنجابی کا زبردست ہاتھ ہے۔ اردو کی صوتی خصوصیات اُسے برج بھاشا سے دور رکھتی ہیں لیکن پنجابی ہریانی اور کھڑی بولی کی صوتی خصوصیات ابتدائی اردو میں پائی جاتی ہیں۔ بعد میں ایسی تبدیلیاں ہوتی گئیں جنھوں نے اُسے پنجابی سے اور دور کر دیا اور کھڑی بولی نکھرتی گئی یہاں تک کہ محض بول چال کے دائرے سے نکل کر وہ ایک ادبی زبان بن گئی۔ جو مسلمان نسلیں ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں اُن کی مادری زبان نہ تو فارسی تھی اور نہ ہو سکتی تھی لیکن ان کی تہذیبی زبان ضرور فارسی تھی۔ اس لیے فارسی اور اُس کے ذریعہ سے عربی الفاظ کا پایا جانا ناگزیر تھا۔ جب آریہ آئے تو وہ دراوڑوں میں گھل مل نہ سکے اس لیے لسانی اختلاط نہ ہوا، جب انگریز آئے تو وہ بھی ہندوستانیوں سے دور دور رہے اس لیے لسانی اختلاط نہ ہوا لیکن مسلمان ہندوستان کے بسنے والوں سے مل گئے اس لیے ان کی بولیاں بھی مل گئیں۔ اس نئی زبان کو ابتداءً کسی نے قصداً الگ زبان کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا، اسے انھیں سماجی اور تمدنی ضرورتوں نے جنم دیا جس پر دنیا کی زبانوں کی پیدائش اور ارتقاء کا مدار ہے۔ اس کی ابتدائی تشکیل میں کسی قسم کی شعوری کوشش نہیں نظر آتی لیکن جن تاریخی حالات نے اسے پیدا کیا تھا وہی اس کے ارتقاء میں معین ہوئے۔ وہی اسے لئے ہوئے ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں گئے۔

اردو کا ارتقاء کھڑی بولی نے جو نیا روپ اختیار کیا تھا، اُسے شروع شروع زبان دہلوی، ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ دکن پہونچ کر دکنی کہلائی اور گجرات میں گجری نام پھر ریختہ، زبان اردو اور اردو کے نام سے پکاری گئی مغربی مصنفین نے ہندوستانی یا

ہندستانی کا لفظ بھی اسی کے لیے استعمال کیا گویا ارتقا کی جتنی منزلیں اس نے طے کیں اتنے ہی نام اس کے پڑتے گئے لیکن آسانی کے لیے اسے اردو یا ہندستانی کہنا مناسب ہوگا۔ اردو کو بادشاہوں اور امیروں نے منہ نہیں لگایا، اسے تہذیبی زبان کا درجہ نہیں دیا لیکن وہ جن ناگزیر تقاضوں کے تحت پیدا ہوئی تھی انھیں نے اسے علاقہ جاتی حدبندیوں کو توڑ کر آگے بڑھ جانے کا موقع دیا۔ صوفی فقیروں اور درویشوں نے اپنا روحانی پیغام پہونچانے کے لیے اس کو منتخب کیا۔ وہ جیسی بھی ٹوٹی پھوٹی ناکمل اور کھردری حالت میں تھی، عوام سے قریب تھی۔ چنانچہ بابا فرید گنج شکر (۱۱۷۳ء سے ۱۲۶۵ء تک) کی طرف جو اشعار اور اقوال منسوب ہیں ان میں اس زبان کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ صوفیوں کے پیش نظر وہی کام تھا جو ہندو بھگت شعرا اور درویش کر رہے تھے وہ عوام کی روحوں کو ملا رہے تھے۔ مادی زندگی کے دوش بدوش روحانی اور ذہنی دنیا میں بھی ہندوستان کئی عظیم الشان تہذیبوں کا سنگم بن رہا تھا[۵۱]۔ امیر خسرو کی پہیلیوں، مکرنیوں اور شعروں میں اس زبان کی عوامی بنیاد کا عکس نظر آتا ہے۔ ابوالعباس نے مسالک الابصار فی ممالک الامصار میں لکھا ہے کہ محمد تغلق کے دربار میں ہندی کے شاعر بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ان شاعروں کی زبان وہی ہوگی جو امیر خسرو کے بعد کے زمانے میں دہلی میں بولی جاتی رہی ہوگی۔ چودھویں صدی عیسوی میں دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہو چکی تھی اور وہاں تھوڑے ہی دنوں کے اندر دکنی اردو نظر آنے لگتی ہے۔ علاءالدین خلجی کی فوجوں اور محمد تغلق کی تبدیلیِ دارالسلطنت نے پہلے ہی سے

---

۵۱ اس موضوع پر بہت سی کتابیں ہیں۔ عام مطالعہ کے لیے ڈاکٹر تاراچند کی "انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر"، ڈاکٹر عابد حسین کی "ہندستانی قومیت اور قومی تہذیب"، ڈاکٹر بینی پرشاد کی "ہندو مسلم کوشیشن" اور محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" دیکھنا چاہیے۔

دکن میں اس کا بیج بو دیا تھا جو تھوڑے دنوں بعد پھل لایا۔ یہاں سب سے پہلی اہم
تصنیف پندرھویں صدی کی ابتدا میں سید گیسو دراز کے رسالہ معراج العاشقین کی
شکل میں ملتی ہے جس میں پنجابی، برج بھاشا اور کھڑی بولی ہر ایک کے اثرات نظر
آتے ہیں کیونکہ اس وقت تک اس کا ڈھانچہ بالکل اثر پذیری کی حالت میں تھا پچاس برس بعد
کے ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنی کتاب نورس نامہ برج بھاشا میں لکھی۔ اس کے
بعد دکن میں ایک سلسلہ قائم ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔ وہاں کے بادشاہوں نے
مختلف وجوہ سے اس نئی زبان میں شاعری کی اور شعراء کی سرپرستی بھی۔ بادشاہ
درباری شعراء، صوفی فقراء اور مذہبی نظم نگاروں نے اسے فروغ دیا اور جس وقت
ابتدائی اردو شمالی ہند میں صرف بول چال کی زبان تھی دکن میں اس میں اچھا خاصا
ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ یہی اثرات گجرات میں بھی کام کر رہے تھے۔ فرق یہ تھا کہ دکن کی
مقامی بولیاں دراوڑ نسل کی تھیں وہ شمال سے آئی ہوئی ابتدائی اردو پر زیادہ
اثر نہ ڈال سکیں کیونکہ ساخت کے اعتبار دراوڑ اور آریائی بالکل مختلف تھیں لیکن
گجراتی ہند آریائی زبان تھی اس لیے ابتدائی اردو اور گجراتی میں اچھی خاصی آمیزش ہو گئی۔
اسی زمانے میں شمالی ہند میں اودھی اور برج بھاشا کو فروغ حاصل ہو رہا تھا
لیکن معاشرتی حالات کی وجہ سے فارسی آمیز ہندستانی بھی بڑھ رہی تھی۔ اس کا
پتہ صوفی فقراء (خاص کر بو علی قلندر، حمید الدین ناگوری، یحییٰ منیری اور سید محمد
جون پوری وغیرہ) کے کلمات سے، ہندو بھگت شعرا کے یہاں فارسی عربی الفاظ
کی آمیزش سے چلتا ہے اور ان لغات سے جو تیرھویں اور پندرھویں صدی
کے درمیان میں لکھی گئیں جس طرح مسلمانوں نے ہندوستان کی بعض زبانیں اختیار

کر لی تھیں اور انھیں کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ اسی طرح ہندوؤں نے فارسی میں کمال حاصل کیا تھا جس طرح ایک لحاظ سے البیرونی، امیر خسرو، عبدالقادر بدایونی، فیضی، داراشکوہ وغیرہ اہم ہیں اسی طرح دوسرے لحاظ سے گرونانک ٹوڈرمل، چندر بھان برہمن وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ہندی کی کوئی تاریخ امیر خسرو، قطبن، ملک محمد جائسی، رس کھان، رحیم خانخاناں کو نظر انداز نہیں کر سکتی کیونکہ اس وقت یہی زبانیں اظہار کا ذریعہ تھیں لیکن جب کھڑی بولی اردو کی شکل میں ترقی کر گئی تو ہندو مسلمان دونوں اس کے گرد جمع ہو گئے، کسی نے اسے یہ کہہ کر نہیں ٹھکرا دیا کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

بہر حال کھڑی بولی کے نیا روپ اختیار کرنے کے بہت سے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں سکندر لودی اور ٹوڈرمل کے ان فرامین کو بھی اہمیت حاصل ہے جن کی وجہ سے ہندو فارسی کی طرف مائل ہوئے۔ ایسے سرکاری احکام دونوں قسم کے اثرات پیدا کر سکتے ہیں، ایک طرف تو فارسی کو بے حد اہمیت حاصل ہو گئی اور دیسی زبانوں کا فطری ارتقا ماند پڑ گیا دوسری طرف فارسی الفاظ عام طور سے لوگوں کی زبانوں پر چڑھنے لگے اور دیسی زبانوں خاص کر دہلی کے گرد و پیش کی زبانوں میں شامل ہو کر ایک مشترکہ تہذیب کی نمایندگی اور تشکیل کرنے لگے۔

تغلق بادشاہوں کے زمانے میں دکن اور گجرات دہلی کی مرکزی سلطنت سے الگ ہوئے تھے اور تقریباً تین سو سال تک آزاد رہے اس لیئے ان دونوں ملکوں میں اردو کا نشو و نما آزادانہ ہوا۔ ان میں ادب بھی پیدا ہوا۔ یہ سچ ہے کہ اکبر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں دکن پھر مکمل طور پر مغل سلطنت کا جزو بن گیا اور

اُس اردو میں جو دہلی میں بولی جاتی تھی اور اُس اردو میں جو دکن میں رائج تھی میل ہوا اور چونکہ شمالی ہند ہی اردو کی پیدائش کی جگہ تھی اس لیے دکن کی اُردو نے شمالی ہند کی اردو کو زیادہ متاثر نہیں کیا بلکہ شمالی ہند کی اردو نے دکنی شکل پر اثر ڈالا۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں جب دہلی کے لوگ ولی کے دیوان سے روشناس ہوئے تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں یعنی بولتے تو ہیں اُردو، جو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے اور شعر کہتے ہیں فارسی میں۔ چنانچہ اسی زمانے سے دہلی میں اردو شاعری کا دورِ عروج شروع ہو گیا اور کسی کی سرپرستی کے بغیر اردو شمالی اور جنوبی ہند کی عام زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اردو کے ہندو مسلمان، پارسی عیسائی، انگریز، فرانسیسی اور یہودی اتنے شاعر پیدا ہو گئے جن کی مکمل فہرست بھی کوئی تاریخ یا کوئی تذکرہ کی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔ اردو کو وہ اہمیت حاصل ہو گئی کہ ڈاکٹر تاراچند کے خیال میں اٹھارویں صدی میں ہندو اور مسلمان دونوں اردو کو اپنی مشترک زبان سمجھنے لگے تھے یہاں تک کہ بھارتیندو ہریش چندر نے جو جدید ہندی کے بہت بڑے مصنف اور مبلغ تھے اس حقیقت کو انیسویں صدی کے وسط میں تسلیم کیا ہے۔ گارساں دتاسی، ہمیز، گلکرائسٹ اور راجہ شیو پرشاد سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اردو ہی ملک کی قومی زبان ہے لیکن یہاں اردو کے ارتقا کی پوری کیا ادھوری تصویر پیش کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ صرف دیکھنا یہ ہے کہ جو زبان اس طرح ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان بن چکی تھی اُس کی مخالفت کیوں کی گئی اور موجودہ صورتِ حال کیا ہے اور اس کے مستقبل کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

قومی زبان کا مسئلہ | یہ مقدمہ اندازے سے بہت بڑھ گیا ہے اس لیے اب

صرف اشاروں سے کام لینا پڑے گا۔ سمجھنے کی پہلی بات تو یہ ہے کہ قومی زبان کے مسئلہ کی نوعیت کیا ہے؟ دنیا کی تاریخ میں کبھی اور کسی جگہ زبان کے مسئلہ نے یہ شکل نہیں اختیار کی جو آج ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے یا بعض وجوہ سے پیدا کی گئی ہے رجعت پسندی، گمراہ حب الوطنی، فرقہ پرستی، لاعلمی، بدنیتی اور کسی حد تک علمی اور عملی دشواریاں اس مسئلہ کی تہہ میں ہیں پڑھے لکھے جاہل اپنی سیاسی اغراض کے لیے زبان کو مذہبی بنا رہے ہیں جو تاریخ میں کبھی نہیں ہوا، اسے ہر وہ ملک جھٹلا سکتا ہے جہاں کئی مذاہبوں کے لوگ بستے ہیں لیکن زبان کے معاملہ میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پھر ہندوستان ہی میں ایسا کیوں ہے؟ جب تقریباً آٹھ سو سال کی کوشش کے بعد عام بول چال کی ایک ایسی زبان بنی تھی جو کسی مخصوص مذہب یا طبقے سے وابستہ نہیں تھی، جو قومی وحدت کی شیرازہ بندی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھی۔ جو صدیوں میں اس ملک کے بسنے والوں کی آزادی اور ترقی کی خواہش کے اظہار کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے پھر ایک قومی زبان کا مسئلہ کیوں پیدا ہوا یہ بات الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ کھڑی بولی کے روپ میں ایک ایسی ہندستانی زبان بن گئی تھی جو جغرافیائی اور محدود لسانی حد بندیوں کو توڑ کر صوبہ جاتی زبانوں کو نقصان پہونچائے بغیر مشترک قومی زبان کا کام دے رہی تھی لیکن انیسویں صدی میں جب انگریزی سیاست نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریقی رجحانات کو بڑھایا، نئے متوسط طبقے نے اصلاحی تحریکیں پیدا کیں جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں الگ الگ اصلاح کا کام شروع کیا، ہندو اور مسلم قوم پرستی کا جداگانہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس وقت زبانیں بھی مذہب کی ترازو پر تولی جانے لگیں۔ فورٹ ولیم کالج میں

پہلی اہم ہندی نثر کی کتاب ایسی ہندی میں لکھوائی گئی جو قدیم ہندی کی کسی ادبی شاخ سے تعلق نہ رکھتی تھی بعض معمولی کوششیں ہوئی تھیں اور اٹھارویں صدی کے آخر میں منشی سدا سکھ نے سکھ ساگر لکھی تھی جس کی بنیاد کھڑی بولی پر تھی لیکن جب للولال جی سے پریم ساگر لکھوائی گئی اس وقت سے جدید ہندی یا ادبی ہندی کی بنیاد پڑی اب تک ہندی کوئی مخصوص زبان نہیں تھی (اودھی، برج بھاشا، بھوج پوری، بندیلی بہاری وغیرہ سب الگ الگ یا ملا کر ہندی کہی جا سکتی تھیں، ہندو اور مسلمان دونوں انھیں میں سے کسی زبان میں اپنے علاقائی یا لسانی تعلق کی وجہ سے لکھتے تھے لیکن کھڑی بولی صرف اس شکل میں رائج تھی کہ وہ ہو تو کھڑی بولی لیکن اس کو وسیع بنانے کے لیے اس میں حسب ضرورت فارسی عربی الفاظ شامل کر لیے جائیں۔ جدید ہندی اس طرح بنائی گئی کہ ارتقائے لسان کی روایتوں سے ہٹ کر کھڑی بولی میں فارسی کی جگہ سنسکرت کے الفاظ شامل کر لیے گئے۔ ہندی بھاشاؤں کی یہ عام خصوصیت تھی کہ اس میں سنسکرت تت سم کم سے کم پائے جاتے تھے۔ جدید ہندی کی یہ خصوصیت قرار پائی کہ اس میں سنسکرت تت سم کی بھرمار ہو، اردو اپنے لسانی ارتقاء اور روایتی تعلقات کے لحاظ سے جدید ہند آریائی بھاشاؤں سے بالکل قریب تھی، جدید ہندی اس ارتقائی عمل کا انکار کر کے سنسکرت سے نیا رشتہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ نئے قومی تصورات اور قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کی خواہشات نے اس کے لیے وجہ جواز بھی فراہم کر دیا۔

یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ جب انیسویں صدی میں نئی ہندو قومیت نے جنم لیا اور اسے ایک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی تو حالات اتنے بدل چکے تھے کہ اس نے برج بھاشا یا کسی اور جدید آکرت کو اپنی زبان نہیں بلکہ ہندستانی

ادبی ہندی کی بنیاد قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس درمیان
ل اردو یا ہندستانی کے نام سے عام ہو چکی تھی اور دوسری
ں کی حیثیت اختیار کر کے اس کی ترقی اور عمومیت کے سامنے
لال جی کے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا، وہ اُسے ہندستانی یا
کے لیے یہی کر سکتے تھے کہ اس میں فارسی عربی کے مستعمل لفظوں
کے الفاظ داخل کر دیں۔ ایک حد تک سنسکرت کے الفاظ شامل
طرح کلچر کی وہ وحدت مجروح نہیں ہوتی تھی جس کی صدیوں میں
مستعمل الفاظ کو ترک کر کے انھیں لینا غلط تھا۔ اس سے بھی زیادہ
ہوا کہ سنسکرت کی بھرمار کی جائے۔

اردو اور سنسکرت آمیز ہندی کی وہی حیثیت ہے جو ملک کے
ہے۔ فارسی عربی اور سنسکرت کے عام فہم الفاظ کے ساتھ
ان کے عوام کی زبان ہے، زیادہ فارسی آمیز کھڑی بولی
طبقے کو پسند آتی ہے۔ زیادہ سنسکرت آمیز ہندی قوم پرست
وں کے دل میں جگہ کر لی ہے اس طرح اردو اور ہندی
وحدت ہے، صرف اوپری ڈھانچہ میں فرق ہے۔ اجبائے ہند
سے کو نظر انداز کر کے تفریق پیدا کرنے والے حصّے کو ابھارا یا
وجھگڑا کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے ماننے والوں نے ایک دوسرے
پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ جدید ہندی کے کھڑی بولی پر
کئی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہوا کہ جدید ہندی مشترک

زبان کی بنیادوں سے قریب رہی اور زبردست اور بڑی اختلافات کے باوجود لسانی حیثیت سے وہی چیز ہے جو اردو ولیکن نقصان یہ ہوا کہ فارسی عربی کے وہ الفاظ بھی نکالے جانے لگے جو عام زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے اور مشترکہ سرمایہ کا جزو تھے اور ان کی جگہ نامانوس سنسکرت لفظوں کو دی جانے لگی۔ یہ لے اتنی بڑھی کہ وہ ہندی الاصل لفظ بھی نکال دیے گئے جو عہد قدیم میں بھاشاؤں سے لیے گئے تھے یا سنسکرت کے وہ لفظ تھے جو تدبھو بن کر خالص تت سم نہیں رہ گئے تھے۔ ایسے لفظوں کو پھر سنسکرت تلفظ دے کر اجنبی بنایا جانے لگا۔

اردو زبان کی پیدائش اور ارتقار کی یہ مختصر داستان ہے اور آج کہا جا رہا ہے کہ یہ بدیسی زبان ہے۔ لسانیات کا طالب علم اسے کیسے تسلیم کر سکتا ہے! جگہ نہیں کہ اس پر اور بحث کی جائے لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ یہ اعتراض مذہبی اور سیاسی ہے اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں بسنے والوں کی تمناؤں اور خیالوں میں پرورش پا کر ملک کی عام زبان قرار پائی۔ ایسی زبان تھوڑے سے فارسی الفاظ کے شامل ہو جانے سے بدیسی کلچر کی نمایندہ نہیں بن سکتی۔ زبان کے تشکیلی دور میں جو الفاظ عاریتاً لیے جاتے ہیں وہ تاریخی تقاضوں اور رابطوں کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی الفاظ خود آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ پندرہ سو سال قبل مسیح جو رشتہ ٹوٹ گیا تھا وہ مسلمانوں کے میل جول سے پھر قائم ہوا اور اس نے جدید ہند آریائی زبانوں کو نئی طاقت بخشی۔ یہ اثر مسلمانوں کی حکومت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے ساتھ اختلاط کا نتیجہ ہے کیونکہ مسلمان حکومتوں نے فارسی اور برج بھاشا کی سرپرستی کی لیکن اردو کو دکن کے سوا اور کہیں یہ اہمیت اٹھارویں صدی کے آخر تک نہیں دی گئی۔ یہ صرف

تجدید اور احیائے قدامت کا جذبہ ہے۔ جو اردو کو ایک بدیسی زبان کا مرتبہ دے سکتا ہے۔ ہندو متوسط طبقہ کی مذہبی اور قومی تحریکوں نے ہندی کو تقویت پہونچائی۔ بدقسمتی سے ہندی کی تحریک اس طرح مذہبی تحریکوں سے وابستہ ہو گئی کہ عام طور سے مسلمان اسے سیکھنے پر مائل نہ ہوئے حکومت نے بھی اس کی کوشش نہیں کی حالانکہ اٹھارویں صدی تک زیادہ تر پڑھے لکھے مسلمان ہندی بھی جانتے تھے۔ اس کے برعکس اردو ہندو اور مسلمان دونوں بولتے اور لکھتے رہے۔ زمانہ قدیم میں مسلمان اسی طرح ہندی کی مختلف شکلوں کے جاننے میں پیش پیش تھے جس طرح ہندو۔ زبانیں مذہبی نہیں۔ زبان ہو یا سیاست، ادب ہو یا کلچر، جب انھیں مذہبی جذبات کے تابع کر دیا جائے گا۔ اس وقت ان میں تفریقی رجحانات زیادہ ہوں گے آج یہی حالت قومی زبان کے مسئلہ کی ہے۔

مستقبل؟ جس انداز میں جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقاء گذشتہ ہزار سال میں ہوا تھا اُسے دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہ تھا کہ ملک کی قومی زبان کیا ہو کیونکہ بہت سے تاریخی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی اسباب کی بنا پر شمالی ہند کی وہ زبان جسے اردو کہا جاتا ہے اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی کہ وہ ہندوستان و پاکستان کے متعدد اور مختلف لسانی علاقوں میں رابطہ کا کام دے یعنی شمالی ہند کے اس علاقہ میں جو پنجاب سے بہار تک پھیلا ہوا ہے۔ علاقائی زبان کی حیثیت اختیار کرے اور دوسرے حصوں میں مشترک قومی زبان کے روپ میں مستعمل ہو لیکن تنگ نظری نے ایسا نہیں ہونے دیا، اُردو اگر قومی زبان بن جاتی تو لامحالہ اس میں اتنی لچک پیدا ہوتی کہ وہ ملکی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے بیش بہا خزانہ سے فائدہ اٹھائے اور ہر علاقہ میں وہاں کی مخصوص زبانوں سے فیض

حاصل کرے لیکن موجودہ حالات میں یہ محض خیال آرائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبانیں کسی حق سے نہیں چلن سے اہمیت اختیار کرتی ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہندی (یعنی وہ جدید ہندی جس کا ارتقاء انیسویں صدی میں شروع ہوا) کل ہندوستان کی سرکاری زبان بن چکی ہے مختلف لسانی علاقوں میں مختلف زبانیں وہاں کے لیے سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں دستور ہند میں اردو کو بھی اس ملک کی ایک قومی زبان قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے لیے کوئی علاقہ معین نہیں ہے۔ اس کا علاقہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہی ہے جسے ہندی کا علاقہ کہا جاتا ہے گویا اردو ہندوستان کی ایک تسلیم شدہ زبان ہے مردم شماری کی رپورٹوں میں اس زبان کو مادری زبان تسلیم کرنے والوں کی معتدبہ تعداد موجود ہے لیکن اُن کے لیے کوئی علاقہ سرکاری طور پر نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی علاقائی حیثیت سے اردو کا کوئی علاقہ نہیں ہے اگرچہ وہ وہاں کی عام مشترک زبان ہے مغربی پاکستان میں اُسے جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی علاقائی زبان کو نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی مختلف تاریخی اور تہذیبی وجوہ سے اردو بالکل اجنبی زبان نہیں ہے گو یہ درست ہے کہ اس کی جڑیں وہاں کی سرزمین میں پیوست نہیں ہیں۔ اس کے برعکس بنگالی وہاں کی اکثریت کی مادری زبان ہے اس لیے حکومت پاکستان کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اردو اور بنگالی دونوں کو سرکاری زبان کا مرتبہ دیا جائے۔

اس طرح موجودہ حالات میں اردو کا مستقبل ہندوستان میں اس سے مختلف ہو سکتا ہے جو پاکستان میں نظر آتا ہے۔ زبان کے معاملہ میں مستقبل بعید کے متعلق کچھ کہنا عقل کی بات نہیں لیکن لسانیات اور تاریخ کا طالب علم مستقبل قریب کے

بارے میں ضرور چند اشارے کر سکتا ہے تاکہ لسانی گتھی اور اُلجھنے نہ پائے زبان کے مسئلہ پر قومی وحدت کا تصور پارہ پارہ نہ ہو، زندہ اور مستعمل زبانوں کا ارتقاء رکنے نہ پائے اور کسی زبان کے معاملہ میں کوئی ایسی ناانصافی نہ ہو جو سیاسی ظلم اور دباؤ کی شکل اختیار کرلے۔ ان باتوں کے متعلق علمی اور منصفانہ نقطۂ نظر رکھے بغیر اردو کے مسئلہ کو نہ تو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ حل کیا جا سکتا ہے، اردو کو بدیسی زبان قرار دینے والے، مسلمانوں کی حکومت کی یادگار سمجھنے والے، غیر قومی جذبات اور احساسات کا مظہر کہنے والے، ایک مخصوص مذہبی فرقہ یا اقلیت کی زبان بتانے والے، نہ صرف علم اللسان کے اصولوں سے ناواقف ہیں بلکہ خود ہندستانی زبانوں کی تاریخ سے نابلد ہیں۔ ایسے لوگ وہ ہیں جو آنکھیں بند رکھ کر ایک پرپیچ راہ سے گذرنے پر مصر ہیں اور مسئلہ کی نوعیت کو سمجھے بغیر اُس کے متعلق فیصلہ صادر کرنا چاہتے ہیں۔

بہر حال اس سلسلہ میں میرا ذہن جن راہوں پر جا رہا ہے انھیں مختصر ترین لفظوں میں پیش کرتا ہوں:

(۱) ہندوستان کی قومی زبان ہندی قرار دے دی گئی ہے اسے تسلیم کرنا چاہیے لیکن علمی انداز میں یہ جدوجہد جاری رکھنا چاہیے کہ یہ ہندی آسان ہندستانی ہو، جس میں عربی فارسی کے مستعمل الفاظ کو اسی طرح جگہ ملے جس طرح سنسکرت کے آسان الفاظ کو۔ اس کو واقعی قومی حیثیت اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ سنسکرت کے جو تدبھو رائج ہیں انھیں پھر تت سم میں تبدیل کرنا لسانی حیثیت سے رجعت پسندی ہے کیونکہ اس طرح ہم زبان کی عوامی تشکیل کو محض صحت اور پاکیزگی کی خاطر برباد کرنے کے مرتکب ہوں گے۔

پاکستان کی قومی زبان اُردو ہونا چاہیے جو بین صوبائی اور تہذیبی ارتباط کے لیے نہایت موزوں ہے۔ بنگالی کو مغربی پاکستان کے لیے بھی قومی زبان کا درجہ دینا مضحکہ خیز ہے۔ مشرقی پاکستان میں البتہ بنگالی کو اردو کے ساتھ قومی زبان کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

(۲) اردو کو پنجاب سے بہار تک کے علاقہ میں علاقائی زبان کی حیثیت دی جائے اگرچہ اردو اور ہندی لسانیاتی مفہوم میں دو زبانیں نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے اس وقت تک انھیں دو الگ الگ زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس جدوجہد کے جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آئیں اور فطری ارتقا کی منزلیں طے کر کے ایک ہو جائیں لیکن ایسا اردو کو نظرانداز کر کے نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا علاقہ میں ثانوی درجوں تک دونوں کی تعلیم لازمی کر دی جائے جب ہر شخص دونوں زبانیں جانے گا تو مستقبل میں اُن کے ایک ہونے میں آسانی ہو گی۔ یہ نتیجہ تعلیم ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس طرح نہیں کہ اردو کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر کھڑی بولی اُردو کی شکل میں پہلے سے موجود نہ ہوتی تو جدید ادبی ہندی وجود میں نہ آتی۔

اس کے علاوہ اُردو کی تعلیم اور استعمال کرنے کی آسانیوں کا انتظام ان خطوں اور شہروں میں بھی ہونا چاہیئے، جہاں اس کو اپنی مادری زبان کے سمجھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

(۳) ہندوستان میں اردو کے لیے فارسی رسم خط جاری رہے۔ جب ہر شخص دیوناگری

اور فارسی دونوں رسم خط جان لے گا تو مستقبل میں اُسے اس بات کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ وہ مستقبل کی زبان کے لیے کون سا رسم خط اختیار کرے۔ ایک رسم خط تو استعمال کا موقع نہ دینا اُس زبان کے بولنے والوں کے ساتھ ناانصافی ہے جو اپنی زبان کے لئے کوئی خاص رسم خط اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس سے قومی وحدت کو نقصان پہونچے گا۔

(۴) ہندوستان اور پاکستان کے ہر لسانی خطّے میں اس خطہ کی زبان کو وہاں کی علاقائی زبان قرار دیا جائے لیکن اگر اُس خطہ میں دوسری زبان یا زبانوں کے بولنے والے موجود ہوں تو اُن کی سہولتوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

(۵) ہندوستانی لسانیات کی تعلیم ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں میں لازمی کردی جائے تاکہ زبان کے بارے میں وہ غلط فہمیاں رفع ہوں جو کشمکش کا سبب بنی ہوئی ہیں۔

(۶) ہندوستان اور پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر مختلف زبانوں کی ترقی کے لئے ادارے اور اکیڈمیاں قائم کی جائیں جن کا کام یہ بھی ہو کہ وہ ایک زبان کا ادب اور علمی خزانہ دوسری زبانوں میں منتقل کریں اور ایک زبان سے دوسری زبان کی رقابت کو گھٹانے کی کوشش کریں۔

(۷) دونوں ملکوں میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے لیے ہر زبان کو اہمیت دی جائے اور ہر جگہ مختلف زبانوں کے سیکھنے سکھانے کا انتظام کیا جائے۔

(۸) ہندوستان کے محکمۂ اطلاعات و نشریات کو چاہیے کہ وہ اپنے کاموں میں اردو کو اس کا مناسب مقام دے۔

(۹) حکومتوں کی طرف سے لسانی جائزوں کے کمیشن مقرر کیے جائیں جو مٹتی ہوئی بولیوں کو محفوظ کرلیں۔ ان بولیوں کے احیا کی کوشش فضول ہے لیکن اُن کے خزانۂ لغات کو اردو ہندی اور دوسری زبانوں کے لغات میں شامل کرلیا جائے۔

(۱۰) علمی اصطلاحات بنانے میں فراخ دلی سے کام لیا جائے اور اگر اپنی زبان میں الفاظ نہ ملیں یا اصطلاحات نہ بن سکیں تو دوسری زبانوں کی ایسی اصطلاحات کو اپنے خزانۂ الفاظ میں شامل کرنے سے پرہیز نہیں کرنا چاہئے جو عام فہم ہوں یا اپنی زبان کے صوتی نظام میں کھپ سکیں۔

(۱۱) ہندی اردو کے مشترک سرمایہ کا جائزہ لیا جائے اور مقامات اشتراک کو اہمیت دی جائے۔

(۱۲) حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ عوام کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے تعلیم میں مندرجہ بالا خیالات کو پیش نظر رکھیں اور زبان کے معاملہ کو رجعت پسند موقع پرستوں کے ہاتھ میں نہ چھوڑیں۔ لسانی سامراجیت اور لسانی رومانیت کے جو خطرات ہمیں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے ہیں ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

یہ ان خیالات کا ادھورا سا خاکہ ہے۔ جن کی روشنی میں اُردو کے مستقبل پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔ یہاں ان باتوں سے بحث نہیں کی گئی ہے جن کا تعلق خود اردو بولنے والوں سے ہے یعنی اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ انھیں خود اپنی زبان اور ادب کی بقا کے لیے کیا کیا کرنا ہے کیونکہ اگر وہی اس بات پر رضا مند نہ ہوں کہ اردو کو باقی رکھا جائے تو پھر مستقبل کے بارے میں سوچنے کا کوئی سوال باقی نہیں رہ جاتا۔ ساری گفتگو اس بات کو تسلیم کرکے کی گئی ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ اردو کو اپنی مادری

زبان سمجھتا ہے، اُسے باقی رکھنے اور پھلتے دیکھنے کا خواہش مند ہے اور اُس کا عقیدہ ہے کہ وہ اسی زبان کے ذریعے سے قومی تعمیر اور تہذیب میں حصہ لے سکتا ہے۔ کچھ عرصے سے یہ صورت حال سے اُس نے فطری طور پر یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ اردو کی ترقی ہی نہیں بقا کی راہ میں کچھ مصنوعی لیکن زبردست رکاوٹیں ہیں اور اگر وہ دور نہ ہوئیں تو اردو ختم ہو جائے گی۔ اسی خیال کے پیش نظر چند ضروری تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ جو زبانیں بن چکی ہیں جنھوں نے اعلیٰ ادب پیش کیا ہے، جنھوں نے تاریخی الفاظ سے ترقی کی ہے۔ جمہوریت پسندوں اور علم دوستوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم انھیں مٹنے نہ دیں۔ کوئی سخت گیر سے سخت گیر مورخ اردو کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے اپنا قومی فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ یہ ایک زندہ زبان ہے جس میں ملک کے بہت سے بسنے والوں کی انسانیت ادب کی صورت میں منتشکل ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی، اُسے زندہ رہنا اور ترقی کرنا چاہیے۔

مزید مطالعہ کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں مفید ہو سکتی ہیں:

۱۔ لینگویج، اِٹس نیچر، ڈیولپمنٹ اینڈ اوریجن ——— آٹو یسپرسن

۲۔ لینگویج ——— ایل۔ بلوم فیلڈ

۳۔ فاؤنڈیشنس آف لینگویج ——— ایل۔ ایچ گرے

۴۔ این انٹروڈکشن ٹو لنگوسٹک سائنس ——— ای۔ ایچ اسٹرٹے وانٹ

۵۔ لینگویج ——— ای ساپیر

۶۔ انٹروڈکشن ٹو ڈسکرپٹیو لنگوسٹکس ——— ایچ۔ اے گلیسن

۷۔ لینگویج ——— وندرائی

۸۔ ہندوستانی لسانیات — ڈاکٹر محی الدین قادری زور
۹۔ زبان اور علم زبان — عبدالقادر سروری
۱۰۔ انڈو آرین اینڈ ہندی — ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی
۱۱۔ دی پرابلم آف ہندستانی — ڈاکٹر تاراچند
۱۲۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا (جلد اول حصہ اول و جلد نہم حصہ اول) سرجی اے گریرسن
۱۳۔ پنجاب میں اردو — پروفیسر محمود شیرانی
۱۴۔ تاریخ زبان اردو — ڈاکٹر مسعود حسین خاں
۱۵۔ اردو زبان کا ارتقا — ڈاکٹر شوکت سبزواری
۱۶۔ ہندی بھاشا کا اتہاس — ڈاکٹر دھیرندر ورما

سید احتشام حسین

ہندستانی لسانیات کا خاکہ

جان بیمز

ہندستانی لسانیات کا خاکہ

باب اول

زبانوں کی گروہ بندی

یورپ اور ہندوستان کی زبانیں تین بڑے خاندانوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔

۱۔ ہند جرمانی[1] ۲۔ سامی[2] ۳۔ تورانی[3]

---

[1] زبانوں کا یہ سب سے بڑا خاندان کئی ناموں سے مشہور ہے سب سے زیادہ عام نام ہند آریائی یا ہند یورپی ہے۔ جغرافیائی محل وقوع اور تہذیبی احاطہ اثر کے لحاظ سے یہ نام مختلف حیثیتوں سے استعمال ہوتے ہیں۔ ہند یورپی عام نام ہے لیکن ہند آریائی اس زبان کے لیے زیادہ صحیح ہے جو ایشیا اور ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ بیمز نے اس کے لیے ہند جرمانی استعمال کیا ہے۔ عہد جدید کے علمائے لسانیات ہند آریائی ہی استعمال کرتے ہیں اس میں فرنچ اکیڈمی کی تحقیقات کے مطابق ۱۳۲ زبانیں شامل ہیں۔ گو بعض خاندانوں میں تعداد کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ زبانیں ہیں لیکن اہمیت، رقبہ بولنے والوں کی تعداد وغیرہ کے لحاظ سے یہ خاندان سب سے اہم ہے۔ چونکہ جرمن محققین نے اس موضوع پر سب سے زیادہ کام کیا ہے اس لیے انھوں نے ہند جرمانی نام زیادہ استعمال کیا ہے۔ جان بیمز نے پوری کتاب میں یہی نام لکھا ہے۔ (مترجم)

[2] سامی نسل کے لوگوں کی زبانیں بھی سامی کہی جاتی ہیں۔ عرب، افریقہ کے بعض خطے اور مشرق وسطیٰ کے اکثر لوگ سامی نسل کی زبانیں بولتے ہیں۔ اس نسل کا تعلق سام ابن نوح علیہ السلام سے بتایا جاتا ہے۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں نے ان زبانوں کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ (مترجم)

[3] جدید علمائے لسانیات زبانوں کے کسی خاندان کو تورانی نہیں کہتے۔ جان بیمز نے ترکی، تبتی، منگولی، پہاڑی اور دراوڑی سب ہی خاندان کی زبانوں کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ (مترجم)

ا۔ ہند جرمانی خاندان میں حسب ذیل شاخیں ہیں :۔

(۱) ہندستانی (انڈک)[1]	(۲) ایرانی
(۳) کلٹک[2]	(۴) اطالوی[3]
(۵) ٹیوٹانی[4]	(۶) سلافی[5]
(۷) یونانی[6]	(۸) ال لیرک[7]

ان میں سے صرف پہلی دو زبانیں ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔

---

[1] اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم نے یہ نام ہندوستان کی تمام آریائی زبانوں کے لیے جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے استعمال کیا ہے ورنہ آج کل ہندستانی کا لفظ جس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے وہ ذہن کو دوسری طرف منتقل کر دیتا ہے (دیکھو مقدمہ)

[2] آریائی اقوام میں ایک قوم ہے کلٹ جس میں شمالی مغربی فرانس، ویلز اور آئرلینڈ کے باشندے شامل ہیں ان کی زبان کلٹک کہلاتی ہے۔ اب ان قوموں اور ان کی زبانوں میں کافی آمیزش ہو گئی ہے (مترجم)

[3] اطالوی، قدیم لاطینی کی قائم مقام ہے اور اٹلی میں بولی جاتی ہے۔ لاطینی کی دوسری شکلیں اسپین فرانس وغیرہ میں ملتی ہیں۔ (مترجم)

[4] ٹیوٹانی زبان ٹیوٹانی قوم کے لوگوں سے موسوم ہے۔ اس میں جرمن اور اسکینڈے نیوین قوموں کے علاوہ انگریزی قوم بھی شامل ہے۔ یہ نسل بھی مخلوط ہو گئی ہے اور ان کی زبانیں بھی۔ (مترجم)

[5] وسطی اور مشرقی یورپ کی کئی قومیں سلافی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا تعین بھی مشکل ہے۔ ان میں عام طور سے بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، روس، سربیا وغیرہ کے لوگ شامل ہیں نسل اور زبان دونوں کے لیے سلافی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (مترجم)

[6] یونانی یا ہیلینک، قدیم یونانی زبان جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے دنیا کی تین یا چار مشہور زبانوں میں رہ چکی ہے۔ اس نے صدیوں یورپ کی تمام زبانوں کو متاثر کیا ہے۔ (مترجم)

[7] زمانہ قدیم میں بحیرۂ ایڈریاٹک کے گرد کی زبانوں کو ال لیرک یا ال لیرین کہا جاتا ہے۔ اب یہاں کی زبانیں اپنے اپنے جغرافیائی خطوں کے نام سے موسوم ہیں۔ ایک طرف اٹلی کی بولیاں ہیں دوسری طرف البانیہ اور یونان کی۔ (مترجم)

۲- سامی خاندان حسب ذیل زبانوں پر مشتمل ہے :-

(۱) عربی (۲) عبرانی[۱] ۳- ارامی[۲]

چونکہ ہندوستان میں کوئی سامی زبان نہیں بولی جاتی اس لیے اس کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں (عربی عنصر جو اس کثیر مقدار میں ہندوستان کی بولیوں میں داخل ہے اس سے اس اصول میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جو عربی لفظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ باقاعدہ عربی قواعد کے مطابق مشتق یا معطوف نہیں ہوتے)

۳- تورانی خاندان دو شاخوں میں منقسم ہے، جنوبی اور شمالی یہاں صرف جنوبی شاخ سے ہمارا تعلق[۳] ہے، جس میں حسب ذیل قسمیں شامل ہیں

(۱) تھائی یا سیامی (۲) ہمالیائی (۳) تبتی (۴) کول (۵) دراوڑی

ہند جرمانی شاخ

ہندستانی : اس قسم کی سب سے قدیم نما ہندہ زبان، ویدکی زبان ہے یہی تحریری سنسکرت کی سب سے قدیم شکل ہے۔ اس کے بعد کلاسکی سنسکرت کی باری آتی ہے جس کی بعد کی تصانیف کی ہم عصر پراکرت یعنی وہ بگڑی ہوئی زبان ہے جو غالباً اس وقت

---

[۱] عبرانی۔ عربی کے بعد سامی نسل کی سب سے اہم زبان۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابیں اسی زبان میں ہیں فلسطین کے ملاقے میں بولی جاتی ہے۔ مذہبی اہمیت رکھنے کی وجہ سے ایک زمانے میں یہودیوں کا خیال تھا کہ یہی تمام زبانوں کی ماں ہے اور یہی خدا کی پسندیدہ زبان ہے۔ (مترجم)

[۲] ارامی بھی ایک سامی نسل کی زبان ہے اور ایشیائے کوچک میں بولی جاتی ہے۔ عہد قدیم میں عبرانی کی حریف تھی آٹھویں صدی قبل مسیح کے بعض کتبے ارامی زبان میں ملتے ہیں۔ حقیقتاً یہ کئی بولیوں کا مجموعہ ہے۔ (مترجم)

[۳] بیمز نے تورانی نسل میں نہ جانے کتنی زبانیں شامل کرلی ہیں۔ جدید علم اللسان نے انھیں الگ الگ گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ بیمز نے ہندوستان کے باہر کی تورانی زبانوں کو شمالی قرار دیا ہے اور ہندوستان کے اندر کی زبانوں اور بولیوں کو جنوبی لیکن یہاں وہ صرف ہندوستانی شاخ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے۔ (مترجم)

کے ہندوستانی عوام بولتے تھے سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل کے سوا کچھ اور نہیں [۵۱] ہے۔ اس کی کئی بولیاں ہیں جو مختلف صوبوں کے نام کی مناسبت سے پکاری جاتی ہیں۔ گو یہ بات مشکوک ہے کہ جن صوبوں کے نام سے وہ منسوب ہیں اُن صوبوں میں کبھی بولی جاتی ہیں یا نہیں۔ انھیں میں کی ایک ماگدھی یا مگدھ یعنی موجودہ جنوبی بہار کی بولی ہے جو مشہور مصلح گوتم بدھ کی مادری زبان تھی اس وجہ سے وہ ان ملکوں کی مقدس زبان بن گئی جہاں بدھ مذہب پھیلا۔ وہ جسے ۲۴۳ق م میں اسے خاص طور سے سیلون لے گیا اور یہ پالی کہلائی [۵۲]۔ اس زبان میں اچھا ادب موجود ہے اسی طرح پراکرت کی ایک بولی سورسینی [۵۳] ہے جو دہلی اور آگرہ کے گرد و نواح میں بولی جاتی ہے اور یہی جینی فرقہ کی مقدس زبان بن گئی جینی [۵۴] عام طور سے مارواڑی ہیں۔ موجودہ زمانے میں اس شاخ کی حسب ذیل زبانیں پائی جاتی ہیں [۵۵]

---

۵۱ پراکرت کے متعلق بیمز کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ پراکرتوں کا وجود سنسکرت کے دوش بدوش ملتا ہے۔ میں نے مقدمہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (مترجم)

۵۲ بیمز نے جس طرح لکھا ہے اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ماگدھی سیلون پہونچ کر پالی کہلائی۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ پالی ان ابتدائی ترقی یافتہ پراکرتوں میں سے ہے جسے گوتم بدھ نے اپنی مذہبی تبلیغ کے لیے استعمال کر کے دنیا کے بہت سے گوشوں میں پہونچا دیا ہے۔ اشوک اعظم کے کتبے اور بدھ مت کی مقدس کتابیں پالی ہی میں لکھی گئی ہیں۔ اگر اس کو کسی جغرافیائی علاقہ سے منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ بہار ہے نہ کہ سیلون۔ (مترجم)

۵۳ پہلے ایڈیشن میں بیمز نے سرسوتی پراکرت لکھا تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں تصحیح کی۔ (مترجم)

۵۴ بیمز کا یہ خیال صحیح نہیں کہ سورسینی پراکرت جین فرقہ کی مقدس زبان بن گئی بلکہ ان زبانوں اور بولیوں کے نام کا تعین اب تک نہ ہو سکا کیونکہ وہ دور تغیر کی بولیاں ہیں، ان میں سے کسی نے اتنی اہمیت بھی اختیار نہیں کی کہ ان کو پالی کی طرح پراکرتوں میں اونچی جگہ مل جاتی اس لئے اکثر محققین نے انھیں جینی پراکرت کہہ دیا ہے۔ (مترجم)

۵۵ یہاں بیمز نے بعض زبانوں پر زیادہ جگہ صرف کی ہے بعض پر بہت کم۔ ہندی کی مختلف بولیوں پر اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت تھی جتنا اس نے لکھا ہے۔ (مترجم)

(۱) ہندی (۲) بنگالی (۳) پنجابی (۴) سندھی (۵) مراٹھی (۶) گجراتی
(۷) نیپالی (۸) اُڑیہ (۹) آسامی (۱۰) کشمیری (۱۱) ڈوگرا۔

ہندی کی بولیاں تعداد میں بہت ہیں جن میں خاص خاص یہ ہیں :۔

(الف) میتھلی پورنیہ اور ترہست کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔
(ب) ماگدھی جنوبی بہار میں
(ج) بھوجپوری شاہ آباد، سارن، چمپارن، گورکھپور، مشرقی اودھ اور بنارس میں۔
(د) کوسالی اودھ اور روہیل کھنڈ میں
(ھ) برج بھاشا اوپری دوآبہ، آگرہ اور دہلی میں[۵]
(و) قنوجی نچلے دوآبہ میں۔
(ز) راج پوت بولیاں (راجستھانی) راج پوتانہ میں ان کی تعداد بہت ہے۔
(ح) بندیلی بولیاں چمبل ندی سے سون ندی تک

پنجابی کی بہت سی بولیاں ہیں حقیقت تو یہ ہے پنجاب میں ہر ضلع کی بولی الگ ہے اور بعض ضلعوں میں ایک سے زیادہ بولیاں ہیں۔

سندھی حسب ذیل بولیوں میں تقسیم ہوئی ہے :۔
(الف) اوپری سندھ کی سراہکی۔

۵۔ برج بھاشا ادبی زبان کی حیثیت سے ضرور دہلی میں جانی جاتی تھی لیکن دہلی کی عام زبان کبھی نہ تھی ہیمز نے کھڑی بولی یا بانگرو کا تذکرہ نہیں کیا ہے اس لیے اردو یا ہندوستانی کا تذکرہ بہت کم ہے آئی لیے اردو یا ہندوستانی کی پیدائش کے متعلق ان کے خیالات زیادہ واضح نہیں ہیں۔ مقدمہ میں وہ نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے جسے جدید علمائے لسانیات تسلیم کرتے ہیں۔

(ب) نچلے سندھ کی لار
(ج) ملتان کی اُچی
(د) کچھ کی کچھی
— مراٹھی کی چار بولیاں ہیں :-
(الف) کونکنی رتناگری اور ساحلی علاقوں میں
(ب) دکھنی
(ج) گومانتکی سوانت واڑی کے قریب بولی جاتی ہے مقامی طور پر اسے کدالی کہتے ہیں
(د) خاندیسی
— گجراتی کی تین بولیاں ہیں جو علی الترتیب
(الف) سورٹھ اور کچھ میں
(ب) احمد آباد میں اور
(ج) کاٹھیاواڑ میں بولی جاتی ہیں
— اصل لپیا لی کو پربتیا یا پہاڑی کہتے ہیں تھوڑے تھوڑے فرق سے حسب ذیل بولیاں بولی جاتی ہیں :-

(الف) پلپا (ب) کمایونی
(ج) گڑھوالی (د) تھارو

— ایرانی :- اس خاندان کی زبانوں کی اصل ژند یا فارسی قدیم ہے سنسکرت سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ ژند نے کو کثرت استعمال سے مذہبی تقدس کی حیثیت

اختیار کرلی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی زبان کا نام نہیں ہے۔ فارسی قدیم میں کچھ تحریریں تھیں جنھیں ژند اوستا کہا جاتا تھا[۱] یہ تحریریں منظوم تھیں۔ ہر شعر کے دو حصے ہوتے تھے: اوستا یعنی متن اور ژند یعنی اس کی شرح۔ جب متن کی زبان مٹنے لگی تو شرح کی زبان نے اہمیت اختیار کرلی اور یہ نام نہ صرف تصنیف کا مشہور ہوگیا بلکہ وہ زبان بھی اسی نام سے موسوم ہوگئی جس میں یہ شرح لکھی گئی تھی۔ اس تصنیف کے بعض حصوں کے متعلق جنھیں گاتھا کہا جاتا ہے یہ خیال ہے کہ انھیں زردشت اسپنتا نے یا خود زردشت نے لکھا ہے۔ ہندوستانی شاخ میں جو حیثیت سنسکرت کی ہے ایرانی میں وہ ژند کی ہے۔ اسی طرح پہلوی، ہزوارش[۲] اور دوسری زبانیں جو ژند اور فارسی جدید کے درمیان میں ہیں ویسی ہی ہیں جیسے ہندوستانی میں پراکرتیں۔ جدید زبانیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) فارسی (۲) کردی (۳) پشتو (۴) اوسی تینی (۵) آرمینی

ان زبانوں کی تفصیلات میں جانا جو ہندوستان کی سرحد کے باہر بولی جاتی ہیں بے سود ہے۔ اسی سبب سے اس خاندان کی باقی ماندہ زبانوں کا ذکر بھی بے کار ہے۔ اب ہم تورانی خاندان کا ذکر کرتے ہیں۔ سامی کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

تورانی شاخ

تورانی خاندان کی جنوبی شاخ: پہلی قسم تھائی یا سیامی ہے جس میں یہ زبانیں شامل ہیں:۔

---

[۱] ژند کے متعلق ہیمز کے یہ خیالات بحث طلب ہیں۔ اکثر علمائے لسانیات نے مختلف رائیں پیش کی ہیں اس جگہ یہ بحث ضروری نہیں۔ اجمالی طور پر آریوں کے ہندوستان آنے سے پہلے کی ایرانی اور سنسکرت کے تعلق کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ (مترجم)

[۲] بعض علما نے پہلوی اور ہزوارش کو ایک ہی زبان لکھا ہے۔ (مترجم)

(۱) سیامی یا تھائی، سیام میں بولی جاتی ہے، (۲) کھمیر یا کمبوجن، کمبوجا میں
(۳) لاؤس، وسطی سیام میں (۴) کھامتی، برما میں
(۵) موان، پیگو میں (۶) شان، تنا سرم میں
(۷) پلاؤنگ، شمالی برما میں

ان کے علاوہ اور بھی زبانیں ہیں جو برطانوی نوآبادیات اور برطانوی احاطۂ اثر سے باہر ہیں۔

دوسری قسم ہمالیائی ہے جسے میکس مولر نے تحت ہمالیائی کہا ہے اس میں یہ زبانیں ہیں:-
(۱) بھوٹیا یا بھوٹانٹا (۲) لیپچا، سکم میں (۳) لمبو، سکم میں (۴) کرانتی، وادی ارن اور مشرقی نیپال میں (۵) مُرمی، مشرقی نیپال اور بلند سلسلۂ کوہ میں (۶) گرنگ اسی علاقہ میں (۷) نیوار، وسطی نیپال میں (۸) ماگار[۱] لشیبی سلسلۂ کوہ اور وسطی نیپال میں (۹) براماہو، نشیبی سلسلۂ کوہ اور وسطی نیپال میں (۱۰) چی پانگ (۱۱) وایو یا ہیو (۱۲) کسُندا یہ زبانیں اودھ کی ترائی میں بولی جاتی ہیں، ہایو مشرقی نیپال میں بھی پائی جاتی ہے۔
(۱۳) سُنوار، مغربی نیپال میں (۱۴) سُرپا، مغربی نیپال میں (۱۵) کنادری یا ملچسان (۱۶) تبرسکاد (۱۷) ہندیسی (۱۸) دراہی یا دورہی (۱۹) دن دار (۲۰) پہسری (۲۱) کسوار (۲۲) پکھیا (۲۳) ٹھکسیا، (۱۸) سے (۲۳) تک سب زبانیں وسطی نیپال میں بولی جاتی ہیں۔

مندرجہ بالا زبانیں ہمالیائی یا تحت ہمالیائی ہیں۔ ماورائے ہمالیائی یا تبتی شاخ

---

[۱] ڈاکٹر کیمپ بل نے گرنگ اور ماگار کو ہندی بولیوں میں گنا ہے انھوں نے جو سبب بیان کیا ہے وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ ان زبانوں کے بولنے والے قبیلے برہمن ہیں (بیمز)

کا ذکر دائرہ تحریر سے باہر ہے۔ یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ سب تبتی کی بولیاں ہیں یا اس سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔

تورانی شاخ کی تیسری قسم لوہتی یا برمی ہے۔ اس میں حسب ذیل زبانیں شامل ہیں۔
(۱) برمی (۲) دھی مل، نیپال اور بھوٹان کی ترائی میں (۳) می چی نیپال اور بھوٹان کی ترائی میں (۴) بودو، کاچر میں (۵) گارو، گارو کی پہاڑیوں میں (۶) اکا (۷) ابور (۸) مشمی (۹) میری (۱۰) ڈونفلا (۶) سے (۱۰) تک آسام کے شمالی سرحد پر بولی جاتی ہیں۔ (۱۱) اکسیا (۱۲) میکر (۱۳) انگامی (۱۴) ناگا (۱۵) سنگ فو (۱۱) سے (۱۵) تک آسام کے جنوبی سرحد پر بولی جاتی ہیں (۱۶) کوکی، چٹاگانگ کے شمال اور ٹپیرا وغیرہ میں (۱۷) مگ (۱۸) کھومیا (۱۹) مرو (۲۰) سک (۲۱) تنگلو (۲۲) روکھنگ (۱۷) سے (۲۲) تک اراکان میں بولی جاتی ہیں (۲۳) دریائے کولاون کی بولیاں، تعداد میں بہت ہیں (۲۴) منی پوری بولیاں (۲۵) کورنگ بولیاں (۲۶) کارن بولیاں۔

"تقریباً کبھی جو لمبائی رقبے میں چھوٹا ہے اور جو ایک دوسرے کی سمجھ میں نہ آنے والی بولیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس علاقہ کے مقابلہ میں جس کا اس وقت ذکر ہے کم اہمیت رکھتا ہے، چاہے ہم گارو، کسیا اور میکر کے رقبے پر نظر ڈالیں یا ان علاقوں پر جو ان کے بالکل نیچے واقع ہیں جیسے کاچر، سلہٹ، ٹپیرا اور چٹاگانگ، چاہے ہم آسام کے ناگا اضلاع کو دیکھیں اور ان علاقوں کو جو ان کے بالکل جنوب میں ہیں یا اوپری اراودی کی وادی اور اس کی شاخوں کو ہمیں اصل زبانوں یا غالباً بولیوں کی اتنی بڑی تعداد ملتی ہے جو ہم شاید ہی پرانی دنیا کے کسی حصے میں پا سکیں۔"

(LATHAM IN ELEMENTS OF COMPARATIVE PHILOLOGY P. 36)

چوتھی قسم کول ہے جس میں یہ زبانیں شامل ہیں :۔

(۱) سنتھال (۲) کول (۳) بھومیج (۴) منڈل، چھوٹا ناگپور میں۔

(۵) کولی ہاں یا ہو (۶) کھونڈ و سمبھل پور وغیرہ میں

(۷) گونڈ (۸) اوراؤں، سرگوجا میں

(۹) راج محلی۔

پانچویں یعنی دراوڑی قسم میں حسب ذیل زبانیں ہیں :۔

(۱) تلگو (۲) تامل

(۳) کنڑی (۴) ملیالم

(۵) تُولو (۶) کُدگو

(۷) تُودو (۸) کوتا

(۹) اِڈولالہ (۱۰) کوہاتم

(۱۱) براہوئی (۱۲) سنگھالی[۵]

---

[۵] چونکہ کلاسکی سنگھالی میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ ہیں اس لئے میکس ملر نے اسے آریائی میں شمار کیا ہے۔ (بیمز)

باب دوم

ہندستانی زبانوں کی تقسیم

منسلکہ نقشے میں ہند جرمانی خاندان اور تورانی خاندان کی زبانیں الگ الگ دکھائی گئی ہیں اور ہر زبان کا علاقہ تقریبًا ٹھیک متعین کیا گیا ہے۔ کوہ ہمالیہ کے دامن میں (جہاں تک ہم کو اعداد و شمار مل سکے ہیں ان پر نظر رکھتے ہوئے) دونوں خاندان اس طرح مل گئے ہیں کہ اُن کے حدود کا الگ کرنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ یہ بات خاص طور سے نیپال کی وسیع سلطنت کے لیے صحیح ہے جو کئی حیثیتوں سے اب بھی ایک نامعلوم سرزمین کا درجہ رکھتی ہے۔

نقشہ میں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے کہ ہند جرمانی زبان کا خطہ تورانی خاندان کے خطے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا۔ راج محل سے ہوتا ہوا، پورب کی طرف ایک چوڑے علاقے میں پھیلتا ہوا یہ لسانی خطہ مغرب سے مشرق کی طرف ایک دیوار کی طرح چلا جاتا ہے یہاں تک کہ آگے جاکر چٹا گانگ کے ادھر تورانی زبانوں کے خطے سے مل جاتا ہے۔

تاریخی حیثیت سے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ ایام قدیم میں پورے ہندوستان کے علاوہ سارے مشرق اور جنوبی ایشیا پر ایسی قوموں کا قبضہ تھا جو تورانی زبانیں بولتی تھیں۔ آریائی قومیں جو ہند جرمانی خاندان کی زبانیں بولتی تھیں

ہندوستان میں جو شمال مغرب کے راستے سے داخل ہوئیں اور آہستہ آہستہ وادیِ گنگا تک پھیل گئیں[1] انھوں نے یہاں کے قدیم بسنے والے تورانیوں کو ناقابل عبور جنوبی جنگلوں اور پہاڑوں میں ڈھکیل دیا۔ اخراج عام طور سے جنوب ہی کی طرف تھا۔ غیر مفتوح تورانی قومیں ہمالیہ کے دامن میں اور ترائی کے جنگلوں میں پہلے ہی سے بسی ہوئی تھیں لیکن جہاں تک ہم کو علم ہے جنوبی علاقے کے جنگل غیر آباد تھے اس لئے بھاگنے والے تورانی بے روک ٹوک وہاں پہونچ گئے۔ ضمناً اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کچھ تبدیلی شمالی حصے کے تورانیوں میں بھی ہوئی کیونکہ اسی طرح ہم ان تعلقات کا پتہ چلا سکتے ہیں جو شمالی بہار کے بعض قبائل اور نیپال میں پائے جاتے ہیں۔ شمالی بہار کے بعض قبائل (مثلاً کیچک یا کراتا) اُن روایات کا ذکر کرتے ہیں جو اب صرف نیپال میں سنی جاتی ہیں۔ قدیم زمانے کی افسانوی نظموں میں خارج شدہ قبیلوں کے دکن ہی کی طرف جانے کا "تذکرہ" پایا جاتا ہے اور ہمالیہ کی جدید تورانی قومیں یا تو اصلاً "برف پار" یعنی تبت سے آئیں یا ہمالیہ کے گرد چکر کاٹ کر برہمپتر کی وادی سے آئیں پہلی جگہ خاص طور سے اہم ہے۔

ظلم اور اخراج کے باوجود بہت سے تورانی دریائے گنگا کی وادیوں میں رہ گئے اس کو تسلیم کرنے کے بھی کافی اسباب موجود ہیں اور جس استقلال سے انھوں نے اپنی ابتدائی بولیوں کی بعض خصوصیات کو اب تک برقرار رکھا ہے اس کی وجہ سے ہم موجودہ شمالی ہندوستان کی بعض زبانوں کی بعض خصوصیات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں (یہ

---

[1] یہ موضوع بھی تاریخ تمدن کا ایک الجھا ہوا مسئلہ ہے ضمناً مقدمہ میں اس کا ذکر آیا ہے تفصیل کے لئے ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی کتاب "انڈو آرین اینڈ ہندی" دیکھنا چاہیئے۔ (مترجم)

خاص طور سے ہندی حرفوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں جیسے "کو" اور جمع بنانے کے لیے "لوگ" اور "سب" کا استعمال)

کافی مدت گذر جانے کے بعد آریائی نسل کے لوگ نیپال کے پہاڑوں اور ہمالیہ کے مرکزی اور مغربی حصوں میں داخل ہوئے لیکن انھوں نے تورانی آبادی کو یک لخت خارج البلد نہیں کر دیا اسی وجہ سے ہمالیائی علاقوں میں بولیوں کا پریشان کن امتزاج پایا جاتا ہے۔

جنوب میں بھی تورانیوں نے راج محل اور کائی مور کی پہاڑیوں اور راس جنگلی یا وحشی علاقے پر جو اڑلیسہ کے جنوب مشرق اور نربدا کے جنوب مغرب میں پھیلا ہوا ہے اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ وہ تورانی قبیلے جو بالکل جنوب میں پہونچ گئے تھے آریائی ہند کے برہمنوں کے ہاتھوں بعد میں مہذب بن گئے لیکن جو پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے وہ اپنی ابتدائی غیر متمدن حالت ہی میں پڑے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دراوڑی خاندان کی زبانوں میں سنسکرت لفظوں کی اس قدر آمیزش پاتے ہیں اور تامل تلگو اور کنڑی زبانیں بولنے والے کول اور گونڈ لوگوں سے بہتر تہذیب کے مالک ہیں۔

مشرق میں آخری زندہ آریائی اثر کی حدیں وہ پہاڑیاں ہیں جو آسام کو سلہٹ ٹپرا اور چٹا گانگ کے کوہستانی سلسلوں کو الگ کرتی ہیں "زندہ" میں اس لیے کہتا ہوں کہ پالی کے اندر سموئی ہوئی شکل میں بدھ مذہب کے لوگ ایک آریائی زبان کو سیام کے جزیرہ نما، جاوا اور ایشیائی مجمع الجزائر میں لے گئے۔

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں نے ان علاقوں میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جو دو مذکورہ بالا خاندان السنہ کے زیر نگین تھے۔ حملہ آور مخلوط قوموں اور قبیلوں

کے لوگ تھے مثلاً ان میں عرب، ایرانی، افغانی، چغتائی ترک، ازبک ترک، دوسرے قبائل اور خاص کر منگولی قبائل سے تعلق رکھنے والے ترک سب ہی شامل تھے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، اُن کے آنے کا واحد نتیجہ یہ ہوا کہ اردو یا ہندستانی پیدا ہوگئی اور عربی زبان کے بہت سے الفاظ قریب قریب ہندوستان کی تمام زبانوں میں شامل ہوگئے اگرچہ اُن کا اثر تورانی زبانوں کے مقابلے میں ہند جرمانی زبانوں میں زیادہ نمایاں ہے۔

جو زبانیں آج ہندوستان میں بولی جاتی ہیں ان پر مختصر سا تبصرہ جس میں جغرافیائی حدود بھی بتلائے گئے ہوں موضوع کو اور زیادہ واضح کرے گا۔

ہندوستان کے شمالی مغربی گوشے سے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ پیشاور، وادی ہزارہ اور دریائے سندھ کے مشرقی اضلاع میں جنھیں ترچ ہزارہ کہا جاتا ہے پشتو اپنے مقامی تغیرات کے ساتھ بولی جاتی ہے جنھیں تقریباً نو لاکھ انسان بولتے ہیں۔[۱]

وادی کشمیر اور پنجاب کے درمیانی علاقہ میں ڈوگرا اور اس کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور خود وادی کشمیر میں کشمیری ہے اور پنجاب کے درمیانی علاقہ میں ڈوگرا اضلاع کی آبادی تقریباً چار لاکھ اور کشمیری کی تقریباً بیس لاکھ ہے

مغرب میں دریائے سندھ سے لے کر مشرق میں ستلج تک اور پہاڑوں سے لے کر ملتان کے قریب تک پنجابی ملتی ہے یہ زبان دو شہروں میں بمشکل ہی ایک طرح بولی جاتی ہوگی خالص پنجابی دریائے راوی اور بیاس کے درمیان بولی جاتی ہے اور جس قدر آپ دکھن کی طرف بڑھتے جائیں وہاں کی بولیاں ہندی کے

---

[۱] بولنے والوں کی یہ تعداد اعداد و شمار کے بعد ہر جگہ وہ ہے جو ۱۹۲۱ء میں رہی ہوگی۔ میں نے مقدمہ میں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق تعداد دی ہے۔ (مترجم)

معیار سے دور ہوتی جائیں گی۔ پنجابی درحقیقت ہندی کی ایک بولی کے سوا کچھ اور نہیں ہے اور غالباً سورسینی پراکرت سے نکلی ہے لیکن ایک الگ رسم خط رکھنے کی وجہ سے مختلف زبان تسلیم کی جاتی ہے اسے تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ انسان بولتے ہیں۔

ستلج کے جنوب و مشرق میں پنجابی آہستہ آہستہ ہندی میں مدغم ہو جاتی ہے اس کی متعین اور یقینی حد بندی نہیں کی جا سکتی ستلج کے کنارے آپ پنجابی بولنے والوں میں ہیں۔ پورب کی طرف بڑھتے ہوئے جمنا کے کنارے پہونچ کر آپ ہندستانی بولنے والوں میں پہونچ جاتے ہیں۔

جتنے وسیع علاقے میں ہندی بولی جاتی ہے کوئی دوسری زبان نہیں بولی جاتی اس کی مغربی حد سرہند کے قریب قرار دی جا سکتی ہے۔ یہ پنجابی کے پہلو بہ پہلو جنوب مغرب کی طرف پٹیالہ اور بہاول پور کے ریگستانوں میں ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ جیسلمیر کے قریب سندھی سے مل جاتی ہے۔ پھر یہ مغرب کی طرف اودے پور کی جانب بڑھتی ہے جہاں اس حد پر ختم ہوتی ہے جہاں سے گجراتی اور مراٹھی شروع ہو جاتی ہیں۔ اندور کے قریب تینوں زبانیں ملتی ہیں۔ یہاں سے وندھیاچل کا سلسلۂ کوہ اسے جنوب کی طرف پھیر کر سون ندی تک پہونچا دیتا ہے جس کے ساتھ ساتھ یہ سرگوجا تک چلی جاتی ہے۔ پھر یہ گنگا کے کنارے سنتھال اور راج محل کی پہاڑیوں کے دامن کو چھوتی ہے اور گنگا کو ۸۷ر۴۵ طول البلد کے قریب پار کرتی ہے اور ایک سیدھے خط میں اتر کی طرف پہاڑوں میں چلی جاتی ہے ظاہر ہے کہ یہ جو حدیں محض قریب قریب صحیح کہی جا سکتی ہیں[۱] سوا اُن جگہوں کے جہاں قدرتی حدیں ہیں۔

---

[۱] یہاں ہیں ہندی کی مختلف بولیوں کا ذکر کرنا چاہیے تھا کیونکہ اُن کے ناموں کی وجہ سے حدوں کے متعین کرنے میں آسانی ہوتی۔ (مترجم)

(جیسے کوئی پہاڑ یا ندی) ہم کہیں بھی کسی زبان کو کسی خاص نقطہ پر ختم ہوتے اور دوسری کو شروع ہوتے نہیں دیکھتے۔ اس طرح اگر آپ پورنیہ سے پورب کی طرف بڑھیں تو وہاں کی ہندی میں بنگالی کی آمیزش زیادہ ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ آپ ایک ایسی جگہ پہونچ جائیں گے جہاں ہندی کا نشان بھی نہ ملے گا لیکن ٹھیک اُس مقام کا بتانا ناممکن ہے جہاں آپ ہندی نہ سنیں بلکہ اُس کی جگہ بنگالی سننے لگیں۔ اسی طرح وسطی ہند میں کسی ایسی جگہ کا تعین مشکل ہے جہاں ہندی ختم ہوتی ہے اور مراٹھی یا گونڈیا کول زبانیں شروع ہوتی ہیں۔ مردم شماری کی رپورٹوں میں ہندی بولنے والوں کی تعداد ۹۷۷،۶۳،۷۰۰،۶ دی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی وہ بڑی تعداد شامل نہیں ہے جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رہتے ہیں اور ہندستانی یا اُردو بولتے ہیں۔ ہندی ہندستانی سب سے زیادہ پھیلی ہوئی ہے اور عام طور سے سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے۔ اسے وہ لوگ بھی ملک کی عام زبان کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں جن کی یہ مادری زبان نہیں ہے۔

بنگالی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے ہندی ختم ہوتی ہے۔ وہ جگہ کہیں پورنیہ اور دیناج پور کے درمیان میں قرار پائے گی اور جس کے شمال میں آسام کی پہاڑیاں ہیں جہاں جاکر وہ آسامی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ وہاں سے جنوب کی طرف مڑکر وہ ان پہاڑیوں سے گھر جاتی ہے جو برہمپتر کے پورب کی طرف واقع ہیں اور چٹاگانگ کے قریب ختم ہو جاتی ہے۔ اس جگہ خراب قسم کی ہندی اور بگڑی ہوئی بنگالی بولیوں کے اختلاط سے عجیب زبان پیدا ہو گئی ہے۔ بنگالی

کی پچھمی حدراج محل کی پہاڑیوں سے قائم ہوتی ہے اور دکھن کی طرف بنکورا اور مدنا پور سے لے کر دریائے سان ریکھا تک گئی ہے جس کے ساتھ ساتھ یہ سمندر تک چلی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۲ر۰۵ر۸۳ر۶۳۵ ہے۔

آسامی جو بنگالی سے مشابہ ہے دریائے برہمپتر کی وادی میں گوالپاڑہ سے سودیا تک بولی جاتی ہے۔ اڑیہ سمندر کے کنارے کنارے سان ریکھا سے گنجام کے قریب تک بولی جاتی ہے۔ خشکی میں اس کی حدیں کچھ غیر معین سی ہیں آہستہ آہستہ یہ زبان کھوندا اور دوسری غیر متمدن پہاڑی بولیوں میں مدغم ہو جاتی ہے اور انھیں میں زندہ ہے۔ بستر اور اس کے قرب و جوار میں بعض گروہ اڑیہ بولتے ہیں بعض کھوند۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ مختلف گروہوں اور طبقوں میں اظہار خیال کے لیے ہندستانی اور بنگالی زیادہ استعمال کی جاتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ہندستانی ہندوستان کے ہر حصے کے لیے مشترک زبان کا کام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے اسے (اُڑیہ کو) تقریباً بیس لاکھ آدمی بولتے ہیں۔

اُن نشیبی پہاڑیوں کا پورا سلسلہ جن کا آخری شمالی نقطہ سکری گلی میں دریائے گنگا سے مل جاتا ہے اور جن کا جنوبی سلسلہ ناگ پور تک چلا جاتا ہے۔ غیر متمدن کول، گونڈ اور دوسرے تورانی قبائل سے بسا ہوا ہے۔ ہندوستان کا یہی وہ حصہ ہے جس سے یورپ کے لوگ سب سے کم واقف ہیں۔ اس علاقہ میں تورانی خاندان کی وہ نو زبانیں بولی جاتی ہیں جو اس خاندان کی چوتھی قسم پر مشتمل ہیں۔ یہ کس طرح اس علاقے میں تقسیم ہوتی ہیں صحت کے ساتھ نہیں

بتایا جاسکتا، اس کے وہ حصے جن تک رسائی حاصل ہوئی ہے پورب میں بنگالی سے، پچھم میں ہندی سے اور دکھن میں تلگو سے قرب رکھتے ہیں۔ یہ زبانیں روز بہ روز ان زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں اپنا اثر کھوتی جا رہی ہیں جو انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔

ان زبانوں میں سے ایک گونڈ ہے جو ناگ پور کے قریب مراٹھی میں ضم ہو جاتی ہے۔ مراٹھی اپنی وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے ہندستانی زبانوں میں صرف ہندی کے بعد رکھی جا سکتی ہے۔ ناگ پور سے شمال کی طرف چل کر اندور جا پہنچتی ہے اور پھر جنوب کی طرف مختلف غیر متعین سمتوں میں ہو کر سورت تک جا کر سمندر سے مل جاتی ہے۔ اندور سے سورت تک اس کے اور گجراتی کے درمیان جو حد بندی کتابوں میں پائی جاتی ہے وہ مبہم ہے اور مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو صحیح اعداد و شمار بتا سکتا۔ یہیں خاندیش کی پہاڑیوں میں بھیل قبیلہ کے لوگ ملتے ہیں جو کول ہی کی ایک بولی بولتے ہیں۔ مراٹھی کا دکھنی خط فاصل ناگ پور سے برابر ہوتا ہوا بیجاپور پہونچ جاتا ہے اور پھر یہ زبان وہاں بلگام اور دھروار کے اضلاع میں ہوتی ہوئی کہیں گوا کے قریب سمندر سے جا ملتی ہے اور کنڑی میں مدغم ہو جاتی ہے۔

گجراتی کے پورب اور دکھن میں مراٹھی ہے۔ اتر میں یہ مارواڑ اور اودے پور کے قریب ہندی سے جا ملتی ہے اور پچھم میں ۱۵٫۷۰ طول البلد کے قریب کچھی اور سندھی سے۔ اس کی بولنے والی آبادی ساٹھ لاکھ ہے۔ کچھی صرف کچھ کے جزیرہ نما تک محدود ہے۔

سندھی دریائے سندھ کے نچلے حصّے کی وادیوں میں ملتان سے ساحل بحر تک بولی جاتی ہے۔ یہ پورب میں راج پوتانہ کی ہندی بولیوں میں مل جاتی ہے اور پچھم میں بلوچی بولیوں سے۔ بیس لاکھ سے کچھ کم لوگ اسے بولتے ہیں۔

تلگو مشرقی ساحل پر گنجام کے قریب پہلے پہل سننے میں آتی ہے اور ساحل ہی سے لگی ہوئی بالکل مدراس کے قریب پولی کٹ تک چلی جاتی ہے۔ اس کی شمالی حد اڑیہ، کول اور مراٹھی سے مل جاتی ہے حیدر آباد کے پچھم میں یہ اپنے ہی خاندان کی کنڑی سے مل جاتی ہے اور وہاں سے میسور کی مشرقی سرحد تک پہونچتی ہے جہاں مدراس کے قریب تامل سے مل کر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

تامل کا علاقہ اتر میں تلگو سے محدود ہو کر دکھن میں راس کماری کی طرف بڑھتا ہے اور مغربی ساحل کے کچھ حصّے کو لیتا ہوا اڑی ونڈرم تک جاتا ہے پچھم کی طرف اس زبان کی حد نیلگری کی پہاڑیاں اور گھاٹ اور میسور کی پوربی حد قرار دی جا سکتی ہیں یہاں تک کہ کڈپا کے قریب یہ تلگو سے مل جاتی ہے سیلون کے شمالی حصّے میں بھی یہ زبان بولی جاتی ہے۔

ملیالم ٹری ونڈرم کے قریب شروع ہوتی ہے اور شمال کی طرف گھاٹ اور سمندر کی طرف منگلور تک بڑھتی جاتی ہے جہاں سے تولو اور کنڑی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔

کنڑی سارے میسور اور کنارا میں بولی جاتی ہے۔ اس کی شمالی حد مراٹھی پر ختم ہوتی ہے۔ تولو منگلور کے گرد و پیش ایک چھوٹے سے علاقے میں ساحل مالابار پر بولی جاتی ہے اور کڈگو کورگ میں۔

اب ہم پھر ہمالیہ کی طرف واپس آتے ہیں جہاں بہت سی بولیاں ایک دوسرے میں مخلوط ہو گئی ہیں۔ آسام کے شمالی سرحد پر پورب سے پچھم جاتے ہوئے علی الترتیب یہ بولیاں ملتی ہیں: اکا، ابور، ڈوفلا، میری، مشمی۔ اس کے بعد بھوٹیا ہے جو ہمیں پورب میں تیستا تک لے جاتی ہے۔ سکم یا اس علاقہ میں، جو تیستا اور سنگھالی لا پہاڑی کے درمیان میں ہے۔ لیپچا اور لمبو بولی جاتی ہیں سکم ترائی میں دھیمل بوڈو دیا میچی اور کوچ ملتی ہیں جو آگے بڑھ کر کوچ بہار کے میدانوں میں اور رنگ پور دیناج پور اور پورنیہ کے شمالی حصوں میں بھی مستعمل ہیں۔ کوچ کے لوگ بگڑی ہوئی بنگالی بولتے ہیں۔

مسٹر ہاج سن اور ڈاکٹر کیمپ بل کی تحقیقات کے مطابق نیپال میں زبانوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے سنگھالی لا پہاڑیوں سے چل کر ہم کو لمبو یا کرانتا ملتی ہے جو پچھم میں دریائے دودکوسی تک پہونچتی ہے۔ شیر دل کو سنگھالی لا کے اوپر سلسلوں میں گورنگ بھی ہیں جو مری قبیلہ سے قریبی تعلق رکھتے ہیں نشیبی پہاڑیوں میں ماگار ہیں جو پچھم میں پلپا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی جگہ کہیں کہیں برہمو، چیانگ، بایو، وایو، اور کسم بھا کو بھی تلاش کرنا چاہیئے۔ وسطی نیپال میں نیوار، پہری اور برہمو (ماگار کی ایک بولی) کے علاوہ درراہی یا دوراہی، دنوار اور پکسیا بھی ملتی ہیں۔ چمپارن اور دوادی کا ٹھمانڈو کی درمیانی ترائی میں تھارو رہتے ہیں ان کا سلسلہ پچھم میں گنڈک ندی تک پھیلا ہوا ہے ان چار آخر الذکر زبانوں کا شمار ہند چینی سلسلہ میں ہوتا ہے۔ باقی ماندہ تورانی ہیں جن میں ہندی کی آمیزش ہے پربتیا یا پہاڑیا ہندی کی ایک بولی ہے جو سارے نیپال میں بولی جاتی ہے اور

وہاں کی سرکاری زبان ہے۔ پہلے باب میں اسے نیپالی کہا گیا ہے۔ اس کے پچھم میں پھرپلپا، ہکسیا، سنوار، سپرا اور کمایوں گڑھوال کی بولیاں ملتی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ ہم کناور کی ملچن، ہندلیبی اور اُس کے اثر میں ہنز سکرتک جا پہونچتے ہیں۔

آسام کی جنوبی کنارے پر بہت سی ناگا اور سنگ فو بولیاں مکرا ور انگامی، کھسیا اور جنتیا کی پہاڑیوں کی زبانیں، کچارکی، بوروا ورگارو کی گارو ملتی ہیں۔ ٹپرا اور چٹاگانگ کے بعض حصوں میں کوکی اور اراکان اور چٹاگانگ میں مگ بولی جاتی ہیں۔ اندرونی حصے کے وحشی قبائل کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ لاتعداد بولیاں بولتے ہیں لیکن جو چیزیں شایع ہوکر ہمارے سامنے آئی ہیں اُن سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ کس قبیلہ کے لیے کون سا جغرافیائی علاقہ متعین کیا جائے۔

ہندستانی بولیوں کی تقسیم کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جو لوگ زبانوں کے مقام اختلاط پر رہتے ہیں وہ اس موضوع پر کام کرکے علم میں بڑا اضافہ کرسکتے ہیں۔

نوٹ: LATHAM نے انگامی کو الگ زبان کی حیثیت دی ہے لیکن مجھے آسام سے جو اطلاع ملی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا شمار ناگا قبائل میں ہوتا ہے۔ ان سرحدی غیر متمدن قبائل کے متعلق ابھی بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔

اسی طرح آسام کے سرحدی قبائل کی ترتیب بھی لے تھم ہی کے یہاں سے دی گئی ہے لیکن اس میں اور کلکتہ کے سروے جنرل آفس کے شایع کردہ بنگال کے شمالی مشرقی علاقہ کے نقشے میں مجھے فرق معلوم ہوتا ہے۔

ارتقائے لسان کے مدارج

ہر زبان دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے: الفاظ اور ان کی تصریف یا مشتقات "لفظ" محض ایک بیان مجرد ہے کسی چیز کا یا صوتی تصویر ہے کسی حالت یا عمل یا چیز کی جیسے آدمی، ہونا، کرنا۔ کسی چیز کی صوتی تصویر کو اسم کہتے ہیں اور حالت یا عمل کی صوتی تصویر کو فعل۔ "اشتقاق" وہ آواز یا جزو لفظ یا آوازوں کا مجموعہ ہے، جو کسی لفظ کی مجرد شکل کو وقت یا مقام یا کسی اور علاقہ کے خیال سے تبدیل کرتا ہے۔[1]

مختلف زبانوں میں لفظ اور اشتقاق کے ارتباط میں فرق پایا جاتا ہے اور یہ فرق محض پہلو بہ پہلو رکھنے سے لے کر مکمل آمیزش یا اختلاط کی شکل تک میں نمایاں ہوتا ہے۔ یعنی بعض زبانوں میں مشتقات صرف لفظ کے پہلو بہ پہلو لکھ دیے جاتے ہیں اور بعض میں لفظ سے اس طرح مخلوط ہو جاتے ہیں کہ ان سے الگ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس ارتباط کی نوعیت اور مقدار ہی سے زبانوں کے مختلف خاندانوں میں تقسیم کرنے اور ہر خاندان کی خصوصیتوں کی حد بندی کرنے کا سب سے اہم اور

---

[1] یعنی لفظ میں ایسی تبدیلی ہو جاتی ہے جو مفہوم کو کسی خاص حالت یا وقت یا جگہ کا پابند بناتی ہے۔ اس طرح بولنے یا کہنے والے کا مافی الضمیر لفظ کے مفہوم میں داخل ہو جاتا ہے مثلاً کرنا سے کرتا ہے۔ کرے گا وغیرہ (مترجم)

سب سے آسان طریقہ ہاتھ آتا ہے

پہلی اور ابتدائی حالت[1] میں اشتقاق خود ہی اپنی جگہ پر لفظ کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے اور اس کا تعلق کسی حیثیت سے مادہ[2] (ROOT) سے نہیں ہوتا جیسا کہ چینی یا دوسری یک جزوی زبانوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ پہلے لفظ سے جو خیال پیدا ہوتا ہے اس میں ترمیم کرنے کے لیے پہلے لفظ کے آگے اور پیچھے الفاظ بڑھا دیتے ہیں۔ یہ سابقے یا لاحقے کے طور پر جوڑے ہوئے لفظ جب تنہا استعمال ہوتے ہیں تو ان کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں۔ حالانکہ دونوں جگہ ان کی شکل ایک ہی ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں اسے واضح کریں گی۔

چینی زبان میں "سے" ظاہر کرنے کے لیے شروع میں "سونگ" (TOUNG) لگا دیتے ہیں جو خود اپنی جگہ پر ایک فعل ہے اور جب تنہا الگ استعمال ہوتا ہے تو "پیچھے چلنا" کے معنی دیتا ہے اور بعد میں "لائی" (LAI) لگاتے ہیں جس کے معنی ہیں "آنا" اس طرح "سونگ پیکنگ لائی" (SUNG PEKING LAI) کے معنی ہوئے "پیکنگ سے" یہاں ہمیں یہ نظر آیا کہ پیکنگ کے اصل خیال میں ترمیم کرنے کے لیے ہم نے دو لفظ بڑھا دیے جو خود اپنی جگہ الفاظ ہیں اور یہاں آکر صرف معنی بدلتے ہیں، شکل میں تبدیل نہیں ہوتے۔

---

[1] جیسے میرنے ارتقا سے زبان کے مدارج کہا ہے اسے دوسرے ماہرین لسانیات نے زبان کی قسمیں قرار دیا ہے۔ اس سے کچھ بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا صرف زبان کے ارتقا کے مسئلہ کو پیش کرنے کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ (مترجم)

[2] مادہ وہ بنیادی لفظ ہوتا ہے جس کی تصریف یا اشتقاق سے بہت سے الفاظ بنتے ہیں جن میں مادے کے حرف یا ان کے جزو یا ان کی آوازیں پائی جاتی ہیں۔ یہ بنیادی حروف عبرانی، عربی اور سنسکرت ہر ایک میں پائے جاتے ہیں مگر ہر جگہ ان کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ ان کا تذکرہ آگے کسی قدر تفصیل سے آیا ہے۔ (مترجم)

مثلاً ایک فقرہ ہے "یونگ یی پاٹاؤ" (YUNG YI-PA-TAU) یعنی تلوار کے ذریعے سے۔ "یونگ" فعل ہے جس کے معنی ہیں "استعمال کرنا"۔ "یی" کے معنی ہیں "ایک" اور "پاٹاؤ" کے معنی ہیں "تلوار" اس لیے معنی ہوئے "استعمال کی ایک تلوار"

چینی فعل میں زمانہ یا طور نہیں ہوتا۔ زمانے کا اختلاف حروف سے ظاہر کیا جاتا ہے جو آزادانہ خود فعل کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً "تسیو" (TSEU) کے معنی ہیں "چلنا"

"تسیو لیاؤ" (TSEU LIAU) = (چلنا + ختم) = چلا

"ای کی تسیو" (I-KI-TSEU) = کرچکا + ختم + چلنا = چلا گیا ہے۔

"یاؤ تسیو" (YAU TSEU) = (خواہش + چلنا) = چلے گا

زبان کی یہ بالکل ابتدائی حالت ہے۔ اس کے بعد جو منزل آئی وہ یہ تھی کہ مشتقات نے الگ لفظوں کی حیثیت سے اپنے معنی کھو دیئے اور صرف مشتق کی حیثیت سے باقی رہی۔ اس کی مثالیں چینی میں بھی ملتی ہیں۔ جیسے جزو "تائی" (TI) جب کسی لفظ سے ملتا ہے تو اضافی حالت کا پتہ دیتا ہے اور انگریزی لفظ "OF" یعنی "کا"، کی حیثیت رکھتا ہے اس کی الگ کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

اس دوسری منزل کی زبانوں میں ترکی کی مثال سب سے زیادہ واضح ہے کہ اس زبان میں مشتق اصل لفظ یعنی مادہ میں جڑا ہوا ہوتا ہے لیکن اس طرح کہ اصل مادہ یا بنیادی لفظ اور اس کے مشتقات آسانی سے الگ الگ کیے جا سکتے ہیں اور ایک ہی نظر میں اس لفظ کے عناصر ترکیبی نظر کے سامنے آسکتے ہیں۔

مثلاً ترکی جزو[1] (SYLLABLE) "ان" (جو پہلے چاہے کوئی معنی رکھتا رہا ہو

---

[1] یہ الفاظ اردو رسم خط کے قاعدے سے لکھ دیئے گئے ہیں ترکی میں کسی اور طرح لکھتے ہیں (مترجم)

اب بے معنی ہے۔ اگر کسی اسم سے ملحق کر دیا جائے تو اس کے معنی "کا یا کی" ہو جاتے ہیں۔
"اِہ یا اَہ"، کا مطلب ہو جاتا ہے "کو یا تک" اور "دان" کے معنی ہو جاتے ہیں "سے"

اب "اِو" جس کے معنی ہیں "مکان" اس کی مختلف شکلیں دیکھئے: "اوِان" (ایک مکان کا) "اوِاِہ" (ایک مکان تک) اور "اِودان" (ایک مکان سے)

اگر اس بنیادی لفظ "اِو" میں ہم "لَر" جوڑ دیں (جو علامت جمع ہے) تو "اوِلَر" بن جاتا ہے جس کے معنی ہیں "مکانات" اور اس کی گردان بھی یوں ہی ہو سکتی ہے "اوِلَران" (مکانوں کا) "اوِلَراہ" (مکانوں تک یا کو) اور "اوِلَران" (مکانوں سے)

جزو "اِم" کے معنی ہیں "میرا"، یہ اسم اور فعل دونوں میں جوڑا جا سکتا ہے[۱]۔ اس طرح "اِو" سے "اِوِاِم"، یعنی "میرا مکان" بن گیا۔ اس کی گردان بھی مندرجہ بالا ٹکڑوں کو ملا کر کی جا سکتی ہے جیسے "اِواِم اِن" (میرے مکان کا) "اِوام اِہ" (میرے مکان کو) اور "اِوام دان" (میرے مکان سے)۔ ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہمیں "اولرام" یعنی "میرے مکانات" ملتا ہے جس کی گردان اسی طرح "اِن"، "اِہ"، اور "دان" کو جوڑ کر ہو سکتی ہے۔

اس آخری لفظ کی تحلیل کرتے ہوئے ترکی زبان کا مخصوص مزاج واضح ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جزو غیر مبدّل اور ناقابلِ اشتقاق ہے لیکن ان غیر تغیر پذیر جزوں کے مجموعے سے وہ تمام ضروری مطالب اور ان کی ترمیمات حاصل کی جا سکتی ہیں، اس طرح "اِوِ" (مکان) "لَر" (بہت سے) "اِم" (میرے) اور "دان" (سے) کا مطلب ہوا "میرے مکانات سے"

---

[۱] یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ اسے کیوں کر دونوں میں جوڑ سکتے ہیں، اس کی بحث گارنٹ کی کتاب "PHILOLOGICAL ESSAYS" میں ملے گی (جیمز)

یہی اصول فعل کے سلسلہ میں بھی کام کرتا ہے۔ اس طرح "اولماک" (OLMAK) کے معنی ہیں "ہونا" اور یہ لفظ صیغۂ حال میں "اولورام" یعنی "میں ہوں" ہو جاتا ہے یہ اس طرح بنا "اول" (ہونا) "ار" (ہونا) "ار" (علامت زمانۂ حال) اور "ام" (میرا) اس کے لفظی معنی ہوئے "ہونا میرا" یا "میرا ہونا"[1]

ہندستانی لسانیات کے طالب علم کے لیے ترکی زبان کی معلومات مخصوص مفاد رکھتی ہے کیونکہ تمام تورانی زبانوں میں بھی سب سے زیادہ باضابطگی سے ترتیب دی ہوئی زبان ہے اور چونکہ اس قسم کی زبانیں تحقیقات کے لیے سب سے زیادہ امید افزا امیدان رکھتی ہیں اس لیے اگر وہ ترکی سیکھنے سے اپنے مطالعہ کی ابتدا کرے تو اُسے سب سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ یہ بہت ہی آسانی سے آجانے والی زبان ہے اور اس پر کام کرنے والا فائدہ میں رہے گا۔

میرا خیال ہے کہ ترکی سے بھی زیادہ اچھی تیاری ہنگری زبان کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں اس کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتا لیکن جو چند مثالیں میری نظر سے گذری ہیں اُن سے یہ خیال صاف صاف پیدا ہوتا ہے کہ جوڑے جانے والے حرفوں کے وجود کے لحاظ سے یہ زبان اس قسم کی اکثر زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔

زبان کی تیسری شکل یا قسم وہ ہے جس میں اُن الفاظ نے جو اشتقاقی حیثیت سے استعمال کیے جاتے تھے نہ صرف اپنی اصلی شکل کھو دی ہے بلکہ ایسے مکمل طریقہ سے اُس بنیادی لفظ سے ملحق ہو گئے ہیں جس کے مفہوم کو وہ محدود اور متعین کرتے تھے

---

[1] یہاں سے کچھ مثالیں چھوڑ دی ہیں ترکی کے علاوہ تلگو سے بھی مثالیں دی تھیں (مترجم)

کہ وہ ایک ہی لفظ معلوم ہوتا ہے اور جنھیں اس کے بعد بغیر مفصل اور مکمل تجزیہ کے الگ الگ لفظوں کی حیثیت سے پہچاننا مشکل ہے۔ یہ شکل تصریفی یا اشتقاقی کہلاتی ہے۔ ہند جرمانی خاندان کی زبانیں اس کی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ اس خاندان کی قدیم زبانوں میں تصریفی عنصر کبھی کبھی بہت واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے لیکن سنسکرت میں بھی، جو ان میں سب سے زیادہ قدیم ہے تصریف اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ مثلاً سنسکرت میں "آسمی" بہ معنی "میں ہوں" پایا جاتا ہے اس کو آسانی سے "اس" بہ معنی "ہونا" اور "می" بہ معنی "میں" یا "مجھ کو" میں تحلیل کیا جا سکتا ہے لیکن اگرچہ "می" میں ضمیر متکلم سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے جس سے ہم اس کا تعلق اس مادہ سے تلاش کر سکتے ہیں پھر بھی "می" کا لفظ "میں" یا "میرا" یا "مجھ کو" کے معنی میں اب سنسکرت میں وجود نہیں رکھتا۔

یونانی میں "ای می" (EIMI) کی تصریف یوں ہو سکتی ہے "ای" (EI) بہ معنی "ہونا" اور "می" (MI) بہ معنی "میں" ہیں لیکن "ای" "ہونے" کے معنی میں ایک الگ لفظ کی حیثیت سے یا "می" "میں" وغیرہ کے معنی نہیں پائے جاتے۔ "ای" (EI) سنسکرت لفظ "اس" کی بگڑی ہوئی شکل ہے

لاطینی میں "سم" (SUM) یوں ہے: "س" (S) بہ معنی "ہونا" "م" (M) بہ معنی "میں" اور "یو" (U) جو ایک مشہور خفیف حرف علت ہے صرف تلفظ کی آسانی کے لیے شامل کر دیا گیا ہے گاتھک[1] میں "ام" (IM) کے معنی "میں ہوں" ہے۔ یہ حقیقتاً "ای" (I) بہ معنی "ہونا" اور

---

[1] قدیم ٹیوٹانی نسل اور اس کی زبان۔ یہ لوگ بحیرۂ بالٹک کے جنوبی ساحل پر آباد تھے۔ انھیں وحشی اور غیر متمدن خیال کیا جاتا ہے لیکن بعد میں یہ لفظ آرٹ کی مخصوص شکل کے لیے استعمال ہونے لگا۔ جس میں عظمت، بھدا پن اور منضبطی کا تصور شامل ہے۔ یہاں وہی قدیم زبان مراد ہے۔ (مترجم)

"م" (M) بہ معنی "میں" ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان زبانوں میں سے کسی زبان میں بھی سابقے یا لاحقے اپنی اصل شکل میں نہیں پائے جاتے بلکہ ان میں سے بعض میں بنیادی لفظ (مادہ) بھی کسی نہ کسی طرح تبدیل ہو گئے ہیں۔

ضمیر واحد حاضر کی شکلوں میں سنسکرت میں "اسی" (ASSI یا ASI) ہے جو "اس" اور "سی" کا مجموعہ ہے لیکن "تو" کے معنی میں "اسی" کا لفظ الگ حیثیت سے نہیں ملتا یونانی میں "ای" (EI) "اسی" کا بدل ہے جس کا تجزیہ یوں ہو گا: "اس" بہ معنی "ہونا"، اور "سی" بہ معنی "تو"، ان دونوں میں سے کوئی الگ زندہ لفظ نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل شکلوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

سنسکرت ——— "بھارتی" = بھار (اٹھانا)، ہلکا "آ" تاکیدی لفظ ہے اور "تی" (وہ)

یونانی ——— "فیری ای" (PHEREI) = "فیر" (اٹھانا) "ی" تاکیدی اور "ای" بجائے "تی" (وہ)

لاطینی ——— "فرٹ" (FERT) = "فر" (اٹھانا) "ٹ" (وہ)

گاتھک ——— "بیرتھ" (BAIRITH) "بیر" (اٹھانا) علامت زیر تاکیدی اور "تھ" (وہ)

انگریزی لفظ "بیرتھ" (BEARETH) ہے جو اب بدل کر (BEARS) ہو گیا ہے۔ IS اور ضمیر HE میں کیا تعلق ہے یہ ایک طویل تجزیہ کے بعد ہی ظاہر ہو سکتا ہے۔

اس خاندان کی زبانوں کے متعلق ہم عام طور سے تورانی خاندان کی زبانوں کے مقابلہ میں اتنا زیادہ جانتے ہیں کہ اس کے بارے میں اور لکھنا بے سود ہے۔

زبان کی ایک شکل یا منزل اور ہے، یہی آخری منزل ہے جہاں کوئی زبان اب تک پہونچی ہے۔ اس شکل میں تصریف کثرتِ استعمال سے اس طرح گھس کر مٹ جاتی ہے کہ اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہ جاتا اور تصریف کے نشان کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ معنی میں جو ترمیم ہوتی ہے اُس کے مٹ جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو جاتا ہے معنی کے امتیاز کو برقرار رکھنے کے لیے نئے الفاظ ملانے کی ضرورت پڑتی ہے اور پہلی نظر میں اس منزل کی زبانیں بھی پہلی قسم کی نحوی ساخت کی معلوم ہوتی ہیں۔ کم سے کم اس حیثیت سے تو ایسا ضرور ہوتا ہے کہ معنی میں ترمیم ظاہر کرنے کے لیئے ایسے سابقوں یا لاحقوں کا استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے اصل یا بنیادی لفظ سے الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً فرانسیسی زبان میں S خاتمہ میں غائب ہو جاتا ہے جو لاطینی میں AT تھا اس طرح PORTE = PORTS اور PORTE=PORTAT میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں ضمائر JE اور IL کا اضافہ کرنا پڑا حالانکہ اس طرح ضمیروں کی تکرار ہو جاتی ہے کیونکہ اگر PORTE=PORTS اور PORTS کے معنی ہیں "میں لے جاتا ہوں" تو پھر IE PORTE کے معنی ہوئے "میں میں لے جاتا ہوں" یوں ہی IL PORTE کے معنی ہوئے "وہ وہ لے جاتا ہے" انگریزی میں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے گو اس حد تک نہیں جتنا فرانسیسی میں۔ مثلاً GOES= GOETH اور یہ GO+HE کا مجموعہ ہے اس لیے HE GOES میں ضمیر دو بار شامل ہے۔

جب زبانیں اشتقاقی منزل سے تحلیلی منزل میں آتی ہیں تو اس عبوری حالت میں زبانوں کی نوعیت میں زبردست تبدیلی پیدا ہوتی ہے جب لفظوں کے باہمی تعلقات کا اظہار خود لفظوں کے اندر تغیر ہو جانے سے ہوتا ہو تو یہ بحث بے کار

ہو جاتی ہے کہ جملہ میں لفظوں کی جگہ کیا ہے لیکن جب لفظوں کے خاتمے بالکل معین ہی نہ ہوں اس وقت معنی کا پتہ سوا اس کے اور کس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ لفظوں کی ترتیب پر نگاہ رکھی جائے۔

خاتموں کا اس طرح حذف کر دینا میرے خیال میں بعض حیثیتوں سے زبان کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ انگریز قواعد کی کتابیں بہت خراب طریقے پر مرتب کرتے ہیں مفہوم بالکل الفاظ کی ترتیب پر مبنی ہوتا ہے۔ انگریزی کے لمبے اور پیچیدہ جملے بے حد احتیاط چاہتے ہیں، صرف ہوشیار لکھنے والے غلطی سے بچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جرمن ہیں جنھوں نے اپنے مشتقات کی اچھی خاصی تعداد برقرار رکھی ہے، وہ آدھے صفحے کا جملہ بھی بغیر کسی قسم کی پیچیدگی کے آسانی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا خیالات پر نہایت سادگی اور صفائی سے عمل کیا جا سکتا ہے۔

گذشتہ ابواب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف قسم کی زبانیں ہیں اور جس طرح کے مطالعہ کو عام بنانا ان خیالات کے اظہار سے مقصود ہے، اس کے لیے اس بات کا علم ضروری ہے کہ ان زبانوں کو ان کے ارتقا کے لحاظ سے کس طرح تقسیم کیا جائے جس قسم کے مطالعہ کو عام کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ جن زبانوں کا اب تک مطالعہ نہیں ہوا ہے وہ کیوں کر لکھی جائیں اور کس طرح لکھی جائیں اور ظاہر ہے کہ مطالعہ کرنے والے کو خود اپنی ہی معلومات اور مواد پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

ہم نے اوپر زبان کے ارتقا کے چار زینے یا چار دور قرار دیے ہیں:-

پہلا نحوی یا ترکیبی جیسے چینی (COLLACATIONAL OR SYNTACTIGAL)

دوسرا۔ جوڑنے والا طریقہ جیسے ترکی (AGGLUTINATING)

تیسرا۔ اشتقاقی یا تصریفی جیسے سنسکرت، یونانی، سامی (INFLACTIONAL)
چوتھا۔ تحلیلی جیسے جدید انگریزی اور فرانسیسی (ANALYTICAL)

تورانی خاندان کے قسم اول، دوم اور سوم کی زبانوں میں سے اکثر و بیشتر پہلے درجۂ ارتقاء میں رکھی جاسکتی ہیں (تھائی، بوہیتی اور ہمالیائی مراد ہیں) یہ اصول بالکل بے کھٹکے پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کی بہت زیادہ ترقی یافتہ زبانیں کبھی دوسرے یعنی جوڑنے والے طریقے سے آگے نہیں بڑھی ہیں اور جو ابھی بالکل دورِ وحشت میں ہیں یا کم ترقی یافتہ ہیں وہ نحوی یا ترکیبی دور میں ہیں، ان قسموں کی ادبی زبانوں کا علم تو ہے جو ابھی ابتدائی حالت میں ہیں لیکن ان کے متعلق تحقیقات کی ضرورت ہے۔ زبان کا جو مطالعہ کرنے والا یہ کہتا ہے کہ ان زبانوں کی کسی بھی بولی کو نحوی یا ترکیبی قرار دیتا ہے اور ہر جزو کو مع ایک الگ مفہوم کے الگ لفظ سمجھتا ہے وہ غالباً کوئی غلطی نہیں کرتا۔

دوسرے یا جوڑنے والے درجے میں تورانی خاندان کی چوتھی اور پانچویں قسم کی زبانیں یعنی کول اور دراوڑی شامل ہیں۔ کول زبانوں میں واضح اور خالص جوڑ پائے جاتے ہیں۔ دراوڑی میں آوازوں کے میل ملاتے اور خوش آوازی کا رجحان اتنا زیادہ پایا جاتا ہے کہ بعض اوقات ان کی شکل اشتقاقی ہو جاتی ہے۔ جو بات پہلی تین قسم کی تورانی زبانوں کے لیے کہی گئی ہے وہی یہاں بھی صحیح ہے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہ ابھی مشکل ہی سے اشتقاقی درجہ تک پہونچی ہیں اور جو غیر ترقی یافتہ ہیں وہ جوڑنے والے درجہ ہی میں ہیں۔

ہند جرمانی خاندان کی زبانوں (پہلی اور دوسری قسم) کا تعلق اشتقاقی یا تیسرے

دور سے ہے، فرق صرف یہ ہے کہ بعض ترقی یافتہ بولیوں میں آخری یا تحلیلی دور کی زبانوں سے مشابہت پائی جاتی ہے

جو اصول ہم دو دفعہ بیان کر چکے ہیں وہی یہاں بھی منطبق ہوتا ہے یعنی جو زیادہ ترقی یافتہ زبانیں ہیں وہ تقریباً تحلیلی حد میں پہونچ گئی ہیں، جو کم ترقی یافتہ ہیں وہ اشتقاقی دور سے آگے نہیں بڑھی ہیں مثلاً نیم سنسکرت فعلی شکلیں فعل کی حالتوں کو ظاہر کرنے والے خاتمے بنگالی میں ہندی کے مقابلہ میں زیادہ پائے جاتے ہیں اس لیے گویا بنگالی ہندی کے مقابلہ میں کم ترقی یافتہ ہوئی۔ ہندی بعض حیثیتوں سے تحلیلی ہے اور بنگالی تقریباً یکسر اشتقاقی۔

[1] اس مختصر سے خاکہ میں بہت سی مثالیں اکٹھا کرنا یا تمام زبانوں کے اجزائے کلام میں تحلیلی شکلیں تلاش کرنا ناممکن ہے۔ عام حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب سے زیادہ اشتقاقی بنگالی، آسامی، اُڑیہ اور گجراتی ہیں اور سب سے کم ہندی اور مراٹھی۔ جہاں تک عربی آمیز ہندی یا اردو کا تعلق ہے یہ تقریباً بالکل اسی طرح تحلیلی ہیں جیسے انگریزی

---

[1] دوسرے ایڈیشن میں یہ آخری پارہ حذف کر دیا گیا ہے۔ میں نے رہنے دیا۔ (مترجم)

باب چہارم

زبانوں کی خاندانی خصوصیتیں

مدارج ارتقاء کے لحاظ سے زبانوں کی تقسیم ہی زبان کی تحلیل کے لیے کافی نہیں ہے یہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے سلسلہ میں پہلا قدم ہے
ہو سکتا ہے کہ دو زبانیں ارتقا کے ایک ہی دور میں ہوں اور پھر بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوں جیسے سنسکرت اور عبرانی، دونوں اشتقاقی دور میں ہیں لیکن دنیا کی کوئی دو زبانیں اپنی ساخت یا خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اتنی مختلف نہ ہوں گی۔

اس مختصر سے خاکے میں ہند جرمانی یا آریائی خاندان کی خصوصیات کا کوئی مکمل خلاصہ پیش کرنا اس لیے بہت زیادہ دشوار ہے کہ یہ روئے زمین کے بڑے وسیع حصے پر پھیلی ہوئی ہے اور آریہ قوم بالکل ابتدائی زمانے سے ایک شاندار اور ترقی پذیر تمدن سے مالا مال رہی ہے۔ اس لیے اس موضوع کے متعلق بہت ہی نمایاں اور واضح نکات پیش کروں گا۔

آریائی زبانیں اشتقاقی اور تحلیلی حالت میں پائی جاتی ہیں لیکن پہلی سے دوسری (یعنی تحلیلی) حالت میں آنے کی منزل کسی واضح اور فیصلہ کن شکل میں نہیں

پائی جاتی جس طرح فطرت کے دو شعبوں میں ہوتا ہے اسی طرح زبان میں بھی مختلف قسمیں، جنس اور نوع سب ایک دوسرے میں مخلوط ہو جاتے ہیں۔ واضح خطِ فاصل یا حد بندیاں نہیں ہوتیں۔ فطرت کوئی صندوقچہ نہیں جس میں بہت سے خانے بنے ہوں بلکہ بہت سی رنگین کڑیوں کی ایک زنجیر ہے

ہمیں ایسی زبانیں بھی ملتی ہیں جو اگرچہ مکمل طور پر تحلیلی نہیں ہو گئی ہیں لیکن اشتقاقی بھی نہیں ہیں اس لیے اس حالت کو دو حصوں یعنی ابتدائی اشتقاقی حالت اور بعد کی اشتقاقی حالت میں تقسیم کر لینا آسان ہوگا۔

بہرحال اس جگہ پر صرف چند سیدھی سادی باتوں کا بیان کر دینا ہی کافی ہوگا کیونکہ اگر دونوں کے فرق مکمل طور پر پیش کیے گئے تو ایک ایسے شخص کے لیے جو پہلی دفعہ اس موضوع سے شناسائی حاصل کر رہا ہے بڑی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ اشتقاقی آریائی زبانوں کی ساخت سے تعلق رکھنے والی اہم خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

اسماء افعال سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ ایک ہی لفظ ایک وقت میں فعل اور اسم نہیں ہو سکتا۔ ایسا صرف اُس وقت ہوتا ہے جب زبان نحوی یا ترکیبی منزل میں ہو۔

تعداد کے اعتبار سے اسم کی تین شکلیں ہوتی ہیں: واحد، تثنیہ اور جمع۔ بہت سی حالتیں ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک مخصوص اور غیر منفک خاتمہ کے رکن رکھتا ہے ان حالتوں کی تعداد واحد اور جمع کو ملا کر مختلف زبانوں میں پانچ سے لے کر نو تک شکلوں میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ تثنیہ میں کسی زبان کی مختلف حالتیں محفوظ نہیں ہیں۔

سنسکرت اور ژند میں آٹھ حالتوں کے لیے صرف تین شکلیں، یونانی میں دو اور لاطینی میں سارے تثنیے غائب ہو گئے ہیں۔

مختلف حالتوں کے خاتمے اُن کے اصل لفظ سے الگ نہیں کیے جا سکتے، نہ انھیں نظر انداز کیا یا گرایا جا سکتا ہے۔ یہ مستقلاً قائم نہیں ہوتے بلکہ جن اسمائے سے وہ ملحق ہوتے ہیں اُن کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔

اس طرح گردان کے بہت سے صیغے ہو جاتے ہیں لیکن تمام گردانوں میں بنیادی قاعدے ایک ہی ہوتے ہیں۔ اور جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں وہ صرف آوازوں کے میل ملانے کے اُن قاعدوں پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جو اس قاعدے کو منضبط کرتے ہیں جس میں حالتوں کے خاتمے اُن اسمی مادوں میں علی الترتیب جوڑے جاتے ہیں جو حروفِ علت یا حروفِ صحیح پر ختم ہوتے ہیں۔

یہ قاعدے بعض زبانوں مثلاً سنسکرت اور ژند اور کسی حد تک لاطینی، یونانی اور آرمینی میں واضح طور پر تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن اُن زبانوں میں بھی جن میں اُن کے آثار بالکل ہی مٹ گئے ہیں، ایک محققانہ تجزیہ کے بعد ان کے عمل کا پتہ لگا لینا ممکن ہے۔

فعل کے بہت سے خاتمے ہوتے ہیں۔ اسم کی طرح اس کے بھی تعداد کے اعتبار سے تین صیغے واحد، تثنیہ اور جمع ہوتے ہیں لیکن اسم ہی کی طرح اس خاندان کی بعض زبانوں میں فعل کا تثنیہ بالکل غائب ہو گیا ہے

فعل کے ہر زمانے کی تین ضمیروں کے لحاظ سے اور تعداد کے اعتبار سے تین الگ الگ شکلیں ہوتی ہیں لیکن عام طور سے تذکیر و تانیث کے لیے الگ الگ شکلیں

نہیں ہوتیں۔ اس طرح I SPEAK, THOU SPEAKEST اور HE SPEAKETH کا اظہار تین مختلف شکلوں میں ہوتا ہے لیکن THOU (MAN) SPEAKEST اور THOU (WOMAN) SPEAKEST میں فرق نہیں ہوتا۔ اس کا تذکرہ اس لیے ضروری تھا کہ سامی زبانوں میں تذکیر و تانیث کے لیے مختلف شکلیں ہوتی ہیں[1]۔

افعال کے وہ خاتمے جن سے ضمیر کا پتہ چلتا ہے یا تو مخفف ضمائر ہیں یا ضمیری شکلیں۔

فعل کا عمل جس زمانے کی طرف اشارہ کرتا ہے ان کی شکلوں کے مختلف معین گروہ ہوتے ہیں اُن حالتوں کے لیے بھی مختلف گروہ ہوتے ہیں جن کے ماتحت وہ عمل کیے جاتے ہیں شکلوں کے ہر ایسے گروہ کے ساتھ (جنھیں فعل کے زمانے یا طور کہا جاتا ہے) ضمیروں کی شکلوں کے بھی گروہ ہوتے ہیں[2]۔ فعل کے بنیادی یا اصل لفظ میں پہلے کچھ تبدیلیاں اس لیے ہوتی ہیں کہ اُسے مفہوم میں ضروری تبدیلی ظاہر کرنے کے قابل بنالیں پھر اس ترمیم شدہ شکل میں تخفیف شدہ ضمیر کا اضافہ کردیا جاتا ہے جو ضمیر شخصی کے خاتمہ یا آخری رکن کا کام دیتی ہے، اس سلسلہ میں آوازوں کے مناسب میل کا خاص خیال رکھا جاتا ہے[3]۔ عام طور سے فعل کے بنیادی یا اصلی لفظ میں کوئی اندرونی

---

[1] صرف سامی النسل کی زبانوں ہی کے لیے نہیں یہ بات بہت سی آریائی زبانوں کے لیے بھی صحیح ہے کہ ان میں افعال سے تذکیر و تانیث کا پتہ چلتا ہے۔ فرانسیسی کے علاوہ خود اردو، ہندی اور کئی دوسری ہندوستانی زبانوں کا یہی حال ہے۔ (مترجم)

[2] بعض زبانوں میں صیغہ امر کو اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا واحد متکلم غائب ہوگیا ہے (ہیمز)

[3] پڑھنے والوں کو غالباً یہ بات کچھ غیر واضح معلوم ہوگی لیکن اس سے زیادہ باریک تصریح کرنا ناممکن ہے کیونکہ کسی اور طرح پیش کرنے سے یہ بیانات اس خاندان کی تمام زبانوں پر منطبق نہ ہوں گے۔ (ہیمز)

تغیر نہیں ہوتا۔

زمانہ ماضی عام طور سے حرف زائد یا حرف یا بول کی تکرار سے ظاہر کیا جاتا ہے زائد کے طور پر مختصر (آ) یا اس کے برابر کا کوئی حرف سابقہ کے طور پر لگا دیا جاتا ہے اور تکرار کی حالت میں پہلے حرف صحیح اور بالعموم اس کے حرف علت کا سابقہ لگایا جاتا ہے کبھی کبھی حرف علت میں متبدلی صوتی تغیر کیا جاتا ہے کبھی حرف صحیح میں، اس قسم کی بعض زبانوں میں حرف زائد اور تکرار کے بول دونوں غائب ہو گئے ہیں ضمائر کی شکلیں گو تفصیلات میں بدل جاتی ہیں لیکن اپنی خصوصیت برقرار رکھتی ہیں۔ وہ یہ ہیں "م" ضمیر متکلم کے لیے "ت" ضمیر حاضر کے لیے اور "س" ضمیر غائب کے لیے۔

اس خاندان کی زبانوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت پیچیدہ خیالات یا خیالوں کے مجموعہ کو ایک ہی لفظ کے ذریعہ سے ادا کر سکتی ہیں کئی لفظ ملا دیئے جاتے ہیں اور حالتوں اور فعل کے زمانوں کے آخری رکن صرف آخری لفظ میں جوڑ دیتے ہیں، اس مرکب کا پہلا ٹکڑا یا تو حرف جار یا حرف ربط ہوتا ہے یا اسم یا کبھی کبھی فعل۔ دوسرے خاندانوں میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی۔[1]

مندرجہ بالا خیالات صرف قدیم آریائی زبانوں پر منطبق ہوتے ہیں کیونکہ موجودہ زبانوں میں سے کوئی بھی مکمل طور سے اشتقاقی نہیں ہے بلکہ سب کی سب کسی نہ کسی پہلو سے تحلیلی ہو گئی ہیں جس عمل سے اس خاندان کی یورپی زبانوں میں یہ تبدیلی ہوئی کہ لاطینی اطالوی، فرانسیسی اور ہسپانوی میں تبدیل ہو گئی۔ اسی عمل سے ہندوستان میں سنسکرت

---

[1] اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی مختلف زبانوں میں بڑے اختلافات ہوتے ہیں لیکن مندرجہ بالا خیالات آریائی اشتقاقی زبانوں کی اہم خصوصیتوں کو مختصراً ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں مفصل معلومات کے لیے (BOPPS' COMPARATIVE GRAMMAR) پڑھنا چاہیئے۔ (بیمز)

ہندی، بنگالی اور مراٹھی میں بدل گئی[1]۔

مگر ان دو قسم کی زبانوں میں تبدیلی کی نوعیت میں کچھ فرق بھی ہیں :۔

۱۔ یورپی گروہ کی زبانوں کے متعلق کافی تاریخی مواد موجود ہے جس سے ہم آسانی سے لاطینی کے اطالوی میں تبدیل ہونے کے عمل اور ارتقار کو دیکھ سکتے ہیں لیکن ہندستانی گروہ میں ایسا نہیں کر سکتے۔ سنسکرت ایک سرے پر ہے تو جدید زبانیں دوسرے سرے پر اور درمیانی حصہ اندھیرے میں ہے جس پر ابھی تک روشنی نہیں پڑی ہے[2] اس لیے ہم بعض اشتقاقی شکلوں کی ابتدا کے متعلق شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۲۔ رومانی زبانوں[3] میں بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کو ہم لاطینی ماخذ تک نہیں پہونچا سکتے کیونکہ وہ یا تو جٹوٹانی خاندان سے آئے ہیں یا کسی اور زبان سے۔ اسی طرح موجودہ ہندستانی زبانوں میں بہت سے لفظ ملتے ہیں جن کا رشتہ سنسکرت سے نہیں جوڑا جا سکتا لیکن ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل یقین دعویٰ (اور یہ صرف دعویٰ ہی ہے) یہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ ان لوگوں کی زبانوں کی یادگار ہیں جو یہاں زمانہ قدیم میں آباد تھے

---

[1] ہندی، بنگالی اور مراٹھی کے موجودہ شکل تک پہنچنے کا عمل اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا بیمز نے ظاہر کیا ہے۔ ان کا براہ راست سنسکرت سے بننا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ (مترجم)

[2] جب بیمز نے یہ لکھا تھا یہ بات بہت حد تک صحیح تھی لیکن اس کے بعد اس موضوع پر بہت کام ہوا ہے۔ خاص طور سے جیولز بلاک کی تحقیقات اہمیت رکھتی ہے۔ خود ہندستانی ماہرین لسانیات نے اس موضوع پر کافی لکھا ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی کتاب "انڈو آرین اینڈ ہندی" کا ابتدائی حصہ اس لحاظ سے اہم ہے۔ (مترجم)

[3] رومانی زبانیں ان زبانوں کو کہا جاتا ہے جو قدیم لاطینی کی بنیاد پر بنیں۔ ان میں فرانسیسی اور ہسپانوی اہم ہیں۔ (مترجم)

اور جنہیں آریہ حملہ آوروں نے مار بھگایا۔

۳۔ رومانی زبانوں کے اشتقاقات اور خاص کر افعال کے اشتقاقات مکمل طور سے لاطینی خصوصیات ظاہر کرتے ہیں جن کو سمجھے بغیر ان کا سمجھنا محال ہے۔ ہندستانی زبانوں میں ان کے متوازی عمل تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ان افعال میں سنسکرت افعال کا پتہ نہیں چلتا۔

تحلیلی زبانوں میں بھی بعض وہی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو اشتقاقی زبانوں میں ملتی ہیں۔ خاص فرق یہ ہے کہ آخر الذکر کی بہت سی شکلیں اپنی بھرپور حالت میں موجود نہیں ہیں ان کی جگہیں یا تو حرف ربط، حرف جار اور لاحقوں نے لے لی ہیں یا مرکب الفاظ نے جنہیں اصطلاحاً "امدادی" کہتے ہیں

اسم میں تثنیہ بالکل ہی غائب ہو گیا ہے اور واحد و جمع میں حالتوں کی تعداد مخفف ہو جانے یا تلفظ میں سے کسی آخری رکن کے گر جانے کی وجہ سے گھٹ گئی ہے اور نحوی میں جو تغیر ہوتے ہیں ان کو ظاہر کرنے کے لئے حرف جار یا حرف ربط استعمال کیے جاتے ہیں جن میں سے بعض ایک شکل میں اور بعض دوسری شکلوں میں استعمال ہوتے ہیں یا اسے اصطلاحی طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ بعض ایک حالت کو اپنے ماتحت لاتے ہیں بعض دوسری کو۔

بعض زبانوں جیسے انگریزی، فرانسیسی اور ہندستانی میں ان حالتوں کے ظاہر کرنے والے آخری رکن بالکل ہی غائب ہو گئے۔ بعض جیسے جرمن بنگالی اور جدید یونانی میں تھوڑی ہی تعداد میں سہی اب بھی موجود ہیں۔

اسی طرح افعال کے بہت سے زمانوں اور طوروں میں سے ان کی

بڑی تعداد غائب ہو گئی ہے اور اپنے مفہوم کے تغیر کو امدادی افعال مثلاً "ہونا"، "رکھنا"، وغیرہ لگا کر ظاہر کیا جاتا ہے فعل کے زمانوں میں ضمیری اختلافات اس طرح گر گئے ہیں کہ عام طور سے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ضمیر کا کوئی لفظ ضرور لگانا پڑتا ہے۔

ضمیر حاضر کا صیغہ دوسرے ضمائر کے مقابلے میں اپنی امتیازی حیثیت زیادہ برقرار رکھتا ہے۔

پرانی شکلوں کو ترک کرنے کی مقدار بہت مختلف ہے بعض زبانیں ایسی ہیں جو اسم کے لحاظ سے تو تحلیلی ہیں لیکن افعال کے لحاظ سے اشتقاقی ہیں جیسے فارسی جدید[1] جس میں اسماء کی گردان تو سابقوں اور لاحقوں کے لگانے سے ہوتی ہے لیکن افعال میں بڑی حد تک اس کی پہلی شکلیں باقی ہیں، مثلاً

روم	رویم
روی	روید
رود	روند

یا آریلینی کا مقابلہ سنسکرت اور بعض تورانی زبانوں کے ضمیری لاحقوں اور سابقوں سے ہو سکتا ہے۔

جدید ادبی جرمنی زبان میں اسمی شکلیں دونوں حالتوں یعنی اسم ذات اور اسم صفات کی حیثیت سے موجود ہیں۔ اس کے برعکس اس کے افعال تقریباً سب کے سب

---

[1] یہاں فارسی جدید سے اُس دور کی فارسی مراد ہے جو ژندا وستا اور پہلوی اور دری کے بعد استعمال ہوتی تھی (مترجم)

"امدادی" اضافوں کے ساتھ معنی دیتے ہیں۔

انگریزی میں اسموں کی حالت ظاہر کرنے والی تمام شکلیں غائب ہوگئی ہیں۔ ہاں اگر ہم اضافی حالت ظاہر کرنے والے S جیسے MAN'S HAND کو ایک حالت ظاہر کرنے والے رکن کا آخری جز و نہ قرار دیں۔ اس کے زمانے کی شکلیں بھی دو کے علاوہ سب ختم ہوگئی ہیں جیسے LOVE اور LOVED. جمع کے ضمیری خاتمے بھی ختم ہوگئے ہیں اور واحد سے بھی ختم ہو رہے ہیں جیسے THOU LOVEST اور HE LOVETH کی جگہ YOU LOVE اور HE LOVES نے لے لی ہے۔

ہندستانی سے سنسکرت کے اسمی مشتقات غائب ہوگئے ہیں اور ان کی گردان سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے کی جاسکتی ہے جمع کے لیے کوئی مخصوص شکل تیزی سے غیر مستعمل ہوتی جا رہی ہے "بات" کی جمع "باتیں" اور "باتوں" ملک کے صرف خاص حصوں تک محدود ہیں[1] فعل کی شکلیں البتہ باقی ہیں لیکن بہت ہی بگڑی ہوئی اور ناقابل شناخت حالت میں، یہاں تک کہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہندی کے افعال سنسکرت سے مشتق ہیں؟ ضمیر کو ظاہر کرنے والے خاتمے صرف صیغۂ امر اور مستقبل میں رہ گئے ہیں (معلوم نہیں اس کا کیا مطلب ہے۔ ہندی اور اردو میں افعال کے صیغوں میں بھی ضمیر کا پتہ چلتا ہے۔ مترجم) سندھی، مراٹھی، پنجابی، گجراتی اور بنگالی میں بھی فعل بنانے کے طریقے قریب قریب ہندی سے ملتے جلتے ہیں۔

---

[1] جمع عام طور سے "سب" یا "لوگ" لگا کر بنا لیتے ہیں ایسا وضاحت کے لئے ہوتا ہے۔ عام طور سے واحد اور جمع میں فرق نہیں کرتے جیسے ایک بیل" اور بیس بیل"۔ (مترجم)

اس جگہ سامی خاندان کی زبان کی ساخت کا بھی ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دینا ضروری ہے کیونکہ موازنہ ہی سے آریائی خاندان کی خصوصیات نمایاں ہو سکیں گی۔
پہلی اور سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سامی زبان میں تمام الفاظ ایک سہ حرفی مادہ سے نہایت واضح طور پر مشتق ہوتے ہیں جن کو آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے یہی سہ حرفی مادّہ سامی زبان کا سب سے زیادہ ہمہ گیر اور اس کو برقرار رکھنے والا عنصر ہے۔

چاہے یہ مادہ تین جزوں کا ہو جیسے عربی اور ابی سینیائی میں، یا دو جزوں کا ہو جیسے عبرانی میں، یا ایک کا ہو جیسے سریانی میں لیکن یہ ہمیشہ تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے یہ تین حرف اپنی اصل شکل میں ضمیر واحد غائب کا پتہ زمانہ ماضی میں دیتے ہیں۔ قَ تَ لَ (اُس نے قتل کیا) رَ کَ بَ (وہ سوار ہوا) کَ تَ بَ (اس نے لکھا) اس سہ حرفی مادہ میں تینوں مقررہ حروفِ صحیح کے درمیان حروفِ علّت کو گھٹانے بڑھانے، جوڑنے یا حذف کرنے یا سابقوں اور لاحقوں کی حیثیت سے جزوں کا اضافہ کرنے سے اصل خیال کی تمام ممکن شکلیں وجود میں آجاتی ہیں یعنی مختلف معانی پیدا ہو جاتے ہیں

مادہ کے تینوں حروفِ صحیح کسی حالت میں بھی اپنی مقررہ جگہیں تبدیل نہیں کرتے درمیان میں حروفِ علّت اور حروفِ صحیح بڑھائے گھٹائے جا سکتے ہیں، جوڑے اور محذوف کیے جا سکتے ہیں لیکن ان تین حروف کی اصل جگہوں میں تغیر نہیں ہوتا۔

صرف وہ تین حروف جو زبر (اَ)، زیر (اِ)، پیش (اُ)، یا اُن کے برابر کے حروفِ صحیح سے پیدا ہونے والی آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں، صوتی حیثیت

سے تبدیلی کی زد میں آسکتے ہیں فعل کے مادوں میں جن میں ان حرفوں میں سے کوئی ایک شامل ہو، اُن کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تین حرف اپنی جگہیں نہیں بدلتے۔

اسم میں حالت کے اظہار کی صرف ایک غیر واضح سی کیفیت ہوتی ہے اور وہ بھی صرف تین حالتوں کی۔ حالت کے اظہار کے آخری رکن یا خاتمے تو ہوتے ہی نہیں اسم کا صرف آخری حرف علت بدلتا ہے۔ فاعلی حالت کے لیے پیش، ظرفی کے لیے زیر اور مفعول کے لیے زبر لگاتے ہیں۔ عبرانی اور سریانی کے خاتمے یا آخری رکن بالکل ہی غائب ہوگئے ہیں؛ اور جدید عربی میں تو ان کا استعمال صرف کبھی کبھی ہوتا ہے۔ حالتوں کے تغیرات عام طور سے سابقوں سے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اس میں واحد، تثنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث سب پائے جاتے ہیں۔

فعل کے صرف دو زمانے ہوتے ہیں اور وقت کے سلسلہ میں ان کے استعمال میں اچھی خاصی اُلجھن ہے۔ عبرانی کا ماضی مطلق ایک سابقہ لگا کر مستقبل میں تبدیل کردیا جاتا ہے اور اسی سابقہ کے ساتھ مستقبل ماضی مطلق بن جاتا ہے، پھر بعض اوقات دونوں حال کے لیے استعمال ہوتے ہیں، حال کے لیے کوئی شکل نہیں ہے اور نہ شکّی کے لیے، نہ شرطیہ کے لیے اور نہ تمنائی کے لیے اور نہ کسی عمل کی مشروط حالت کے لیے۔

زمانے کے ہر صیغے کے لیے تذکیر و تانیث کے لحاظ سے مختلف شکلیں ہیں "وہ بولا"، "وہ بولی" سے مختلف ہے اور یہی حالت زمانے کی تمام شکلوں میں رہتی ہے۔ بس ضمیر متکلم کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہاں بولنے والے کی موجودگی اس تفریق کو بے سود بنا دیتی ہے۔

فعل کے ضمیری خاتمے ضمائر ہی ہوتے ہیں جو کسی قدر مٹ گئے ہیں لیکن اس قدر نہیں جتنے آریائی زبانوں میں۔ ایک خصوصیت یہ البتہ ہے کہ ماضی مطلق میں یہ ضمیری رکن آخر مادہ یعنی اصل لفظ میں جوڑے جاتے ہیں اور مستقبل میں سابقوں کی حیثیت سے۔

متصل اور منفصل کی حیثیت سے ضمائر کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ضمیر متصل اسم اور فعل دونوں میں جوڑی جاتی ہے اور منفصل کی مخفف یا تبدیل شدہ شکل ہوتی ہے جہاں کسی عمل کا مفعول ضمیر ہوتی ہے آریائی زبانوں میں اسے اسم سمجھا جاتا ہے اور جملہ میں اسے اس کی مناسب جگہ پر اور مناسب حالت میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس سامی زبان میں ایسی ضمیر کو جو مفعول کی حیثیت رکھتی ہو اسی فعل میں جوڑ دیا جاتا ہے جس کی وہ مفعول ہے۔ مثلاً عبرانی میں قِتَلْتَنِی (تو نے مجھے مار ڈالا) جیسا قَتَلْتَ (تو نے مار ڈالا) اور نِی (جو اَنِی کا مخفف ہے اور جس کے معنی ہیں مجھے یا مجھ کو) کے برابر ہے۔

اسی طرح اسموں میں جہاں آریائی زبانوں میں ضمیر اضافی استعمال ہونا چاہیے اس جگہ سامی زبان میں ضمیر متصل استعمال کرتے ہیں مثلاً کِتَابِی (میری کتاب) کِتَابٌ اور ی (اَنِی بہ معنی میں کی جگہ جس کے معنی یہاں "میری" کے ہیں) کا مجموعہ ہے۔ اس قسم کی تمام زبانیں اشتقاقی حالت میں ہیں۔ جدید عربی کسی قدر تحلیلی زبان بننے کی طرف مائل ہے۔

تورانی خاندان کی زبانوں کی مثالیں گذشتہ باب میں کافی دی جا چکی ہیں اس کے علاوہ وہ اس قدر پھیلی ہوئی ہیں اور عام طور سے اُن کے متعلق آپنی کم واقفیت

ہے کہ چند الفاظ میں ان کی خصوصیات بتانا اگر بالکل محال نہیں تو تقریباً ناممکن ضرور ہے۔ بہر حال حسب ذیل باتوں پر نگاہ رکھی جاسکتی ہے :۔

۱۔ لہجہ یا زور دینے کا ایک نہایت ہی نازک اور پیچیدہ طریقہ جو مقدار اور درجہ میں چینی لہجے کے پیچیدہ طریقے سے لے کر گیاری (ہنگری کی ایک زبان) کے حروفِ علّت کے ترتیب دینے کے نہایت سادہ طریقوں تک مشتمل ہے۔

۲۔ اسمار کی حالتیں اور افعال کے زمانی صیغے ایک غیر تغیر پذیر یک جزوی مادہ میں دوسرے تبدیلی پیدا کرنے والے جزو جوڑ کر بنائے جاتے ہیں، چاہے یہ جزو ایسے مکمل الفاظ ہوں جو الگ مادّے کی حیثیت سے استعمال کیے جاسکتے ہوں یا ایسے الفاظ جنھوں نے اپنا علٰحدہ وجود ختم کردیا ہے (پہلی قسم کے الفاظ ترکیبی یا نحوی زبان سے تعلق رکھتے ہیں، دوسری قسم کے جوڑ کر بننے والی زبان کے دور سے۔

۳۔ فعل کے مادّے میں ضمیر کے اظہار کے لیے کسی ترمیم کی عدم موجودگی بھی اس کی خصوصیت ہے۔ اس طرح اسم کے مادہ میں حالت کے اظہار کے لیے کوئی ترمیم نہیں ہوتی۔

۴۔ مندرجہ بالا وجہوں سے ان زبانوں کی ساخت میں یک جزوی ہونے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرکب حروف صحیح نہیں ہوتے عام قاعدہ یہ ہے کہ ہر حرف علت ہونا چاہیے، ایسے الفاظ جیسے سنسکرت کا سمرتی یا انگریزی کا STRENGTH تورانی زبانیں بولنے والے کے تلفظ میں آ ہی نہ سکے گا۔ یہ خیال اس خاندان کی شمالی زبانوں کے مقابلہ میں دکنی زبانوں

کے لیے زیادہ صحیح ہے۔

بعض تورانی زبانوں میں ضمیر متصل پائی جاتی ہے جو کئی حیثیتوں سے سامی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ یہ اس خاندان کی شمالی زبانوں میں زیادہ ترقی یافتہ شکل میں ملتی ہیں۔ دراوڑی زبانوں اور ہمالیائی زبانوں میں اگرچہ بالکل ہی غائب نہیں ہو گئی ہیں تو بہت ہی کم پائی جاتی ہیں۔

بولیاں
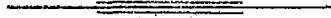
ہندستان میں بہت سی زبانیں مستعمل ہیں لیکن اس گنتی میں ان بہت سی انسانی بولیوں کی فہرست نہیں شامل ہے جو اس ملک میں بولی جاتی ہیں۔ کوئی زبان بالکل ٹھیک ایک ہی شکل میں ایک پورے رقبے میں نہیں بولی جاتی۔ یہ بات ایک حقیقت کے طور پر کہی جاسکتی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان، چاہے وہ کتنے ہی مختصر علاقے میں کیوں نہ بولی جاتی ہو، بولیوں کے اختلاف سے خالی نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں کہ زبان کسے کہتے ہیں اور بولی کی کیا خصوصیات ہیں؟ کسی مخصوص زبان کے مرکزی معیار سے کتنا ہٹنا بولیوں کا اختلاف قرار پاسکتا ہے اور کس نقطہ سے آگے بڑھ جانے سے ایک نئی زبان کے حدود شروع ہو جاتے ہیں؟ کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر کبھی کوئی قطعی رائے نہ قائم کی جاسکے گی کیونکہ یہ ان موضوعات میں سے ہے جن کے عام قاعدے مقرر کرنا ناممکن ہے۔ جغرافیائی محل وقوع، سیاسی اور مادی اتفاقات، تعلیم، عادات، مذہب سب کا اثر زبان پر پڑتا ہے۔

اول الذکر (یعنی جغرافیائی محل وقوع) کی مثال کے طور پر ہم انگلستان کو

دے سکتے ہیں چونکہ یہ جزیرہ ہر طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے اس لیے انگریزی زبان
کسی دوسری زبان میں خاموشی کے ساتھ داخل نہیں ہوتی۔ اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ
اور ویلز کی کلٹک زبانیں واضح حد ود رکھتی ہیں۔ اس بات میں کبھی کسی کو دشواری
نہیں ہوئی ہے کہ وہ نچلے حصے کی اسکاچستانی زبان کو انگریزی کہے یا کوئی کلٹک بولی
ہالینڈ اور فلینڈرس میں تقریباً وہی لوگ ہیں، جو ہماری نسلوں سے مماثلت رکھتے
ہیں لیکن دونوں کے خط فاصل بہت واضح ہیں گو فلیمش (یعنی فلینڈرس کی زبان)
یارک شائر کی بولی سے بہت مشابہ ہے لیکن کوئی یہ نہ کرے گا کہ اُسے انگریزی کی
کوئی بولی قرار دے یا اس کے زبان کہے جانے کے حق کو تسلیم نہ کرے۔

سیاسی اتفاق کی ایک مثال یہ ہے کہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں ایک آزاد
اور خود مختار حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقہ
کی بولی ایک زبان سمجھی جانے لگی، گو حقیقتاً اُسے بھوج پوری یا برج بھاشا سے
زیادہ اس بات کا حق حاصل نہیں ہے۔ پنجابی کے معاملہ میں مذہب کا اثر بھی شامل
ہے سکھ مذہب نے گورمکھی رسم خط کو ایک مقدس حیثیت دے دی کیونکہ گرنتھ صاحب
(سکھوں کی مقدس کتاب) اسی رسم خط میں لکھی گئی اس لیے اس زبان کو بھی اہمیت
حاصل ہو گئی جس میں یہ کتاب لکھی گئی تھی۔

کوہ ہمالیہ کی خاص ساخت نے تبت کی بہت سی بولیوں کو زبانوں کا مرتبہ
دلا دیا ہے مطلب یہ ہے کہ پہاڑی سلسلوں کے درمیان، نہ کوئی دریا ہیں اور نہ دلدلے
بلکہ دشوار گزار جنگلوں سے شروع ہونے والی ڈھلوان پہاڑی چٹانیں جو کبھی کبھی
سات، آٹھ بلکہ بارہ ہزار فٹ اونچی نکل جاتی ہیں۔ ہمالہ کو دنیا کا بے حد دشوار گزار

پہاڑ بنا تی ہیں۔ دکنی تبتیوں کے چھوٹے چھوٹے حلقوں نے جو تاریک جنگلوں میں رہتے ہوئے ہیں اور دوسرے قبائل سے الگ تھلگ ہو گئے ہیں اپنی مادری زبان میں جس کا اب پتہ بھی نہیں چلتا، ایسے تغیرات کر لیے ہیں کہ ان پہاڑی بھاشاؤں کو بولی کے نام سے پکارنا زبان کے معنی اور مفہوم سے لاعلمی کے برابر ہوگا۔

جس طرح علحدگی بولی کی حیثیت کو بہتر بنانے میں مدد کرتی ہے اُسی طرح تعلیم بولی کی ترقی کو روکتی ہے جو زبان لکھی نہیں جاتی یعنی تحریری نہیں ہے اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی صحت کا کوئی ایسا معیار نہیں مقرر کیا جا سکتا جس سے مختلف شکلوں میں اس کو جانچا جا سکے۔ ہم بالکل ابتدائی دور سے دیکھ سکتے ہیں کہ جن قوموں کے پاس رسم خط تھے اور اُن کی زبانیں لکھی گئی ہیں انھوں نے لسانی اتحاد نسبتاً زیادہ برقرار رکھا ہے۔

جہاں تک ہمارے علم میں ہے ہم جانتے ہیں کہ جو سنسکرت اجین میں لکھی جاتی تھی وہ اُس سے مختلف نہ تھی جو اجودھیا میں لکھی جاتی تھی فلسطین کے عبرانی مقدس صحیفے ہمیں بولیوں کے تغیرات کا بہت کم پتہ دیتے ہیں۔ گو اعتراض کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پراکرت[1] کی مختلف شکلیں سنسکرت کی ہم عصر تھیں لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پراکرت کا استعمال صرف آن پڑھ عوام کرتے تھے اور سنسکرت کا اس کی ساری پیچیدگیوں کے ساتھ صرف پڑھے لکھے لوگ۔ اگر ڈراموں سے اس بات کا ثبوت فراہم کیا جا سکے کہ واقعی کن باتوں پر عمل درآمد ہوتا تھا تو یہ پتہ چلے گا کہ

---

[1] RAMATARHARVA GITHA نے جو فہرست دی ہے (اور جس کا حوالہ LASSEN نے INSTITUTIONES PRAKRICAE میں دیا گیا ہے) ان کی تعداد ۲۲ بتا ئی ہے (مترجم)

سنسکرت بولنے والوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ ڈراموں میں صرف بادشاہ اور برہمن سنسکرت استعمال کرتے ہیں۔ سنسکرت ادب کے زوال کے بعد اور عہد وسطیٰ[1] کے دور تاریک میں جب ہندوستان اور یورپ ہر جگہ علوم برائے نام زندہ تھے یا بگڑنے اور مخلوط ہونے کی صورتیں پیدا ہو کر ترقی کر گئی تھیں یہ صورت حال پیدا ہوئی تھی جو ہم آج بولیوں کی شکل میں ہندوستان میں پاتے ہیں۔

بولیوں کے ایک ہی زبان سے تعلق رکھنے کے بارے میں جو کسوٹی طیار کی گئی ہے بلکہ بعض لوگوں نے اسے یقین کے ساتھ استعمال بھی کیا ہے وہ ایک دوسرے کا آپس میں قابل فہم ہونا ہے۔ اگر دو آدمی دو مختلف قسم کی بولیاں بولتے ہوئے ملیں اور ایک دوسرے کو سمجھ لیں تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دونوں بولیاں کسی ایک مشترک زبان سے تعلق رکھتی ہیں اگر نہ سمجھ سکیں تو دو زبانوں سے۔ اس اصول کا ایک کمزور پہلو جس کی وجہ سے وہ بالکل ناقابل اعتبار رہ جاتا ہے یہ ہے کہ انسانی ذہن ایک بہت ہی تغیر پذیر چیز ہے جس کی وجہ سے سمجھنا یا نہ سمجھنا گویا ایک اضافی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر ایک لندن کا باشندہ کچھ کہے تو ہیمپشائر کا ایک نوجوان کسان سر کھجا کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے گا اور ایک لفظ بھی نہ سمجھے گا۔ اس کے برعکس ایک پڑھا لکھا آدمی ذرا سے غور و خوض سے ہیمپشائر کے آدمی کی بات سمجھ لے گا۔

یہی سب کچھ نہیں ہے۔ ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں جب دو زبانوں میں الفاظ یا ان کی بڑی تعداد مشترک ہوتی ہے لیکن ان کی ساخت از روئے قواعد بالکل

---

[1] عہد وسطیٰ سے تقریباً سنہ [illegible] سے [illegible] تک کا زمانہ مراد ہے لیکن اسے بالکل تاریک کہنا بہت درست نہیں ہے (مترجم)

مختلف ہوتی ہے۔ یہی بات ہندی اور بنگالی کے لئے صحیح ہے۔ دونوں میں سنسکرت سے لیے ہوئے الفاظ کی تعداد بہت ہے اور ہر حیثیت سے یکساں، پھر بھی دونوں کا نظام قواعد ایک دوسرے سے اتنا مختلف ہے جتنا ہو سکتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص دونوں کو ایک ہی طرح نہیں سمجھ سکتا۔

ایک دوسری صورت وہ ہے جہاں قواعد میں تقریباً یکسانیت ہوتی ہے لیکن الفاظ بالکل یا تقریباً بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ شکل ہندی اور پنجابی میں رونما ہوئی ہے گو پنجابی میں بہت سے الفاظ وہی ہیں جو ہندی میں لیکن پنجابی میں بہت سے الفاظ جو سنسکرت سے لیے گئے تھے اب بھی موجود ہیں اور ہندی سے نکل گئے ہیں۔ اسی طرح جو سنسکرت الفاظ ہندی میں ہیں وہ پنجابی میں باقی نہیں رہے۔ اس کے علاوہ پنجابی میں اتنے مقامی الفاظ اور اتنی اصطلاحات داخل ہو گئی ہیں کہ اس کا ذخیرۂ الفاظ ہندی سے بالکل مختلف ہو گیا ہے ان دونوں میں بھی یہ بات نہیں پائی جاتی کہ دونوں ایک ہی طرح سمجھی جا سکیں۔

اس کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں جہاں بولی کی دو شکلیں یکساں یا قریب قریب یکساں ہیں اور یہ یکسانیت الفاظ میں بھی پائی جاتی ہے اور نشست الفاظ میں بھی لیکن ان کے تلفظ میں اس قدر فرق پایا جاتا ہے کہ سننے میں وہ دو الگ الگ زبانیں معلوم ہوتی ہیں۔ سریانی اور کلدانی، شیشبی علاقہ کی اسکاچستانی اور انگریزی اس کی مثالیں ہیں۔

مندرجۂ بالا تینوں شکلوں میں ہم نے یہ دیکھا کہ کسی نہ کسی حیثیت سے دو ملتی جلتی بولیاں ایک دوسرے کے لیے قابل فہم نہیں ہیں تاہم بنگالی ہندی سے مختلف زبان

ہے، پنجابی کو پھر ایک بولی شمار کیا جا رہا ہے، سریانی کو ہمیشہ کلدانی کی ایک بولی شمار کیا گیا ہے اور شیبی علاقہ کی اسکاچستانی کو انگریزی کی ایک بولی۔

جہاں نظریہ اور عمل دونوں میں اس قدر بے تعینی اور ابہام موجود ہو وہاں اس جھگڑے کو علم اللسان کا ایک عام سوال قرار دے کر اس وقت نظر انداز ہی کر دینا بہتر ہوگا اور ہر زبان میں شکلوں کے تنوعات پر جہاں تک ممکن ہوگا نگاہ رکھنا ہوگی چاہے وہ الفاظ کے لحاظ سے ہو چاہے قواعد کے۔ بہرحال جس وقت ہندوستان کی زبانوں پر غور کیا جائے اُس وقت یہ کرنا چاہیئے کہ ذیلی حیثیت رکھنے والی بولیوں کو مستند زبانوں میں سے اُس زبان کے ساتھ متعلق کر دینا چاہیئے جس سے وہ سب سے زیادہ ملتی جلتی ہوں۔ جب ہندوستان کی تمام زبانوں کی تحقیقات کی جا چکی ہوگی۔ اس وقت یہ معلوم کر لینا آسان ہوگا کہ بولی کی کوئی شکل آزاد زبان کی حیثیت رکھتی ہے یا کسی زبان کی محض بدلی ہوئی شکل ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ موجودہ معلومات کے بھروسے پر کوئی اصول پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اس کتاب کے پہلے باب میں میں نے زبانوں اور بولیوں کو عام طور سے تسلیم شدہ حساب سے تقسیم کر دیا ہے لیکن مجھے یہ ضروری معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا خیالات بھی ظاہر کر دوں، کچھ اور خیالات بھی ذیل کی سطروں میں پیش کرتا ہوں تا کہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

آریائی خاندان کی زبانوں کے متعلق عام طور سے یہ معلوم ہے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہیں اس لیے یہ ضروری نہیں رہ جاتا کہ اُس حدفاصل کا پتہ لگایا جائے جو بولیوں کو زبانوں سے الگ کرتی ہے۔ آسانی اسی میں معلوم ہوتی ہے کہ بھوجپوری

کو ہندی کی ایک بولی قرار دیا جائے اور بنگالی کو الگ ایک زبان، کیونکہ اگرچہ بھوجپوری قواعد کے اعتبار سے ہندی سے اس قدر مختلف ہے جتنی بنگالی ہے تاہم ملک کے جس حصے میں وہ بولی جاتی ہے وہ صرف دیہات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور جو شخص بھی تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لیتا ہے وہ اسے چھوڑ کر اردو اختیار کر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہار کے ایک شخص کی سماجی حیثیت اور اعزاز کا اندازہ کم و بیش اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی بول چال میں دیہاتی بولی کا عنصر کتنا ہے لیکن بحث کا یہ طریقہ دوسری شکلوں کے لیے صحیح نہیں ہے۔ مثلاً ماگاری جو نیپال کی پہاڑیوں میں بستے ہیں اپنی مختصر اور محدود زبان پر شرم محسوس کرتے ہیں۔ وہ لوگ پہاڑی گڈریے ہیں جن میں جنگ آزما روح ہے اسی لیے وہ زیادہ تر جنگ[1] بہادر کی فوجوں میں بھرتی ہو گئے ہیں وہاں وہ کھاسی یا درباری نیپالی بولنے لگے ہیں جو ایک آریائی بولی ہے وہ اپنی تبتی زبان صرف آپس میں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے ایک مکمل مثال بھوجپوری سے مماثل موجود ہے ماگاریوں کے پڑھے لکھے اور اونچے طبقے کے لوگ آہستہ آہستہ اپنی زبان چھوڑ کر نیپالی اختیار کرتے جا رہے ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ ماگاری نیپالی کی کوئی بولی ہے۔

جو خیالات غیر مربوط شکل میں ظاہر کیے گئے ہیں اُن کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم ہندوستان کی سرحد پر بولی جانے والی لاتعداد زبانوں اور بولیوں پر غور کریں تو یہ ضروری ہوگا کہ انھیں باقاعدہ تقسیم کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی

---

[1] جنگ بہادر راجہ نیپال کا مشہور وزیر تھا جو برطانیہ کا بہت وفادار تھا اور جس نے گورکھوں کی ایک فوج لے کر ۱۸۵۷ء کے غدر میں لکھنؤ کے قریب کیمپ بل کی مدد کی اور غدر کرنے والوں کو شکست دی (مترجم)

اصول ہو مثلاً گیا اکا، ڈوفلا، میری، اور شمی الگ الگ زبانیں ہیں یا مندرجہ بالا
خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں ایک یا ایک سے زیادہ قسم کے تحت لایا جاسکتا
ہے؟ اگر ایسا ہو سکے تو علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے یہ فائدے کی بات ہو گی علمی
حیثیت سے اس لیے کہ کسی ایک زبان کا وجود جو بہت سی بولیوں میں تقسیم کر دی گئی
ہے ہمیں بجائے کئی کے ایک مستقل حقیقت کا پتہ دیتا ہے اور اگر یہ ثابت ہو سکے کہ
ان میں باہم بولیوں کا تعلق ہے اور یہ ایک ہی خاندان کی زبانیں نہیں ہیں تو ان کی
خصوصیات ایک دوسرے پر زبردست اور واضح روشنی ڈالیں گی، اس طرح پورے
مسئلہ پر ہماری گرفت زیادہ مضبوط اور پسندیدہ ہو جائے گی اور انھیں زبانوں کے
عام خاندان میں ٹھیک جگہ پر رکھنے میں آسانی ہو گی۔ عملاً یہ فائدہ ہے کہ ایک زبان
سیکھنا کئی زبانوں کے سیکھنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کا احساس رکھ کر مطالعہ کرنا کہ بولی کی ان شکلوں
کو زبان کے بجائے بولی ثابت کرنا مفید ہو گا۔ یہ نتیجہ نکالنے کے لیے درست نہیں
علمی مسائل کی مناسب تحقیقات کے لیے اس سے زیادہ مہلک اور کوئی چیز
نہیں ہو سکتی کہ پہلے ہی سے بنے بنائے اصول مقرر ہوں اور ہر چیز انھیں کی روشنی
میں دیکھی جاسکے ہیں، قصداً واقعات کو توڑ مروڑ کر کسی نظریے پر منطبق کرنے کو برا سمجھتا
ہوں کیونکہ اس کا درجہ بے ایمانی سے کچھ ہی کم ہے اور یہ کہنے کی شاید ہی ضرورت
ہو کہ اس سے بچنا چاہیے لیکن اس بات پر اتنا زور دیے بغیر بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ
اکثر لوگ ان واقعات کو فوراً قبول کر لینے کا جذبہ رکھتے ہیں جو ان کے پہلے سے بنائے
ہوئے نظریات کی تائید میں ہوتے ہیں اور انھیں برا بھلا کہتے ہیں جو ان کے

مخالف ہوتے ہیں جو شخص کسی نئی زبان یا نئے علم کا مطالعہ کرتا ہے اُس کے ذہن کو جنبہ داری سے بالکل پاک ہونا چاہیئے اور اگر ایسا نہ ہو تو کم سے کم ہر وقت اپنے خیالات کا محاسبہ سختی سے کرتے رہنا چاہیئے۔ واقعات کو اس طرح یقینی طور پر دیکھنا چاہیئے کہ ان میں شک کی گنجائش نہ رہ جائے۔ انھیں خاموشی سے پرکھنا اور قلم بند کرنا چاہیئے اور جب تحقیقات مکمل ہو جائے یا کم سے کم اس نقطہ پر پہونچ جائے جہاں طالب علم کو آگے بڑھنے کی گنجائش نہ معلوم ہو، اُس وقت اُن واقعات یا معلومات کے اثرات یا جو نتائج اخذ کئے جانے والے ہوں اُن کے حاصل کرنے کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے

خاتمہ میں میں اُن خاص باتوں کو پھر پیش کر دینا چاہتا ہوں جنھیں بولیوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں ذہن میں رکھنا چاہیئے گو اس میں بعض باتوں کے دہرائے جانے کا خطرہ ہے۔

ا۔ بولیوں کا باہم سمجھا جانا کوئی یقینی کسوٹی نہیں ہے کیونکہ اس کا دارومدار افراد کی سمجھ پر ہے۔ وحشی اور دیہقانی جسے دشوار سمجھیں گے، پڑھے لکھے لوگ اسے معمولی بات جانیں گے۔

۲۔ کسی جگہ کے لوگوں پر جو اثرات پڑتے رہے ہیں اُن کو پیش نظر رکھ کر اس باہمی طور پر سمجھے جانے کے اصول کو اس حد تک کام میں لایا جا سکتا ہے کہ اگر دو شکلوں میں بولی جانے والی دو بولیاں ایک دوسرے کے لیے باہم اجنبی ہیں تو انھیں باہم سمجھا جانا چاہیئے اور ہو سکتا ہے کہ ایک طالب علم جو ان میں سے ایک بولی کا ماہر ہے وہ اگر مکمل طور پر نہیں تو قریب قریب اچھی طرح دوسری بولی کو سمجھ سکتا ہے چاہے خود اُس ملک کے دو باشندے نہ سمجھ سکتے ہوں۔

۳۔ یہ اثرات کیا ہیں؟ جغرافیائی محل وقوع، تہذیب، سیاسی اور مادی اثرات
مذہب، تلفظ کے اختلافات اور تعلیم۔

۴۔ اگر کوئی ان پڑھ آدمی کسی لفظ کا تلفظ غلط کرے اور پڑھا لکھا آدمی ٹھیک طور پر ادا کر سکتا ہو تو اس چیز کو بولی کی خصوصیت تصور نہ کرنا چاہئے جیسا کہ اکثر کیا جاتا ہے (یعنی ان پڑھ لوگوں کے غلط تلفظ کو ایک الگ بولی نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ مترجم)

۵۔ یہ صورت کہ کسی قسم کی بولی کو بہت تھوڑے سے لوگ بولتے ہیں اس کے ایک مستقل زبان ہونے کے خلاف دلیل کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ جو قبیلہ اسے بولتا رہا ہو وہ کبھی بڑا رہا ہو اور جنگ یا کسی اور سبب سے اب چھوٹا رہ گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی خاص مذہب نے کسی قبیلہ کی زبان کو بڑھنے اور پھیلنے سے روک دیا ہو جیسے عبرانی یا پھر ایک تیسری شکل بھی ہو سکتی ہے جیسی کہ بسکانی[1] پیش کرتی ہے جس کی تمام اہم خاندانی بولیاں مٹ گئی ہیں اور ان کی جگہ نسل انسانی کے دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے قبائل آ گئے ہیں۔

۶۔ یہ خیال غلط ہے کہ دیہاتی بولیاں زبانوں کی زوال پذیر یا بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ ان زبانوں میں جن سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ بات عام طور سے دیکھی جاتی ہے کہ ان میں بالکل شروع ہی سے کئی بولیاں پہلو بہ پہلو ملتی ہیں۔ اتفاق وقت سے ان میں سے ایک لے لی جاتی ہے، اس کو پھلنے پھولنے، بڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے، اس میں ادب پیدا ہوتا ہے، دوسرے ذرائع سے اس کا دامن وسیع ہوتا ہے۔

---

[1] بسکانی (BASQUE) ایک اسپانوی زبان ہے۔ (مترجم)

اور باقی بولیاں اپنی ابتدائی گمنامی کی حالت میں پڑی رہ جاتی ہیں لیکن اس حالت میں خراب ہونے کے بجائے اکثر ان میں الفاظ کی اصل اور ابتدائی شکل باقی رہ جاتی ہے۔ حالانکہ ترقی یافتہ بولیوں کے وہ الفاظ غائب ہوجاتے ہیں۔

مثلاً انگلستان میں لندن کو اتفاقات نے دارالسلطنت بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی انگلستان میں بولی جانے والی انگریزی کو اتنی اہمیت دی گئی کہ وہی کلاسکی زبان کی بنیاد بن گئی۔ اس کے برعکس شمالی انگلستان کی انگریزی جو ایک زمانے میں نہ صرف بول چال میں بلکہ ادب میں بھی اس کی حریف رہ چکی تھی اب قریب قریب مکمل گمنامی کا شکار ہوگئی ہے۔

اسی طرح انجیل مقدس کے اس ترجمہ نے جو مارٹن لوتھر[1] نے ادبی جرمنی کی سیکسینی بولی میں کیا، اس بولی کو کلاسکی زبان اور ادبی طرز نگارش کی بنیاد بنا دیا اسی طور سے مغلوں کے دہلی کو دارالسلطنت قرار دینے ہی نے موجودہ ہندستانی کو وہ شکل دے دی ہے جو ہم آج دیکھتے ہیں۔ یہ دہلی اور اس کے گرد و نواح کی ہندی بولی ہے جس کو نکھار کر، نرم اور لطیف کر کے، عربی اور فارسی الفاظ کے بڑے ذخیرے سے وسیع بنا کر یہ شکل دی گئی۔ اگر مسلمانوں نے اپنا دارالحکومت پٹنہ کو قرار دیا ہوتا تو اغلب ہے کہ بھوجپوری پر ہندستانی کی نیو رکھی جاتی۔

مندرجۂ بالا خیالات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ بولیوں کے ضمن میں بہت سی باتیں کہی جانے اور مطالعہ کرنے کے قابل ہیں۔ ان مختصر

---

[1] مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء سے ۱۵۴۶ء تک) جرمنی کا مشہور مذہبی مصلح جس نے قدیم عیسائی مذہب رومن کیتھولزم کے خلاف جس کا پیشوا پوپ تھا علم بغاوت بلند کیا۔ انجیل کا ترجمہ جرمنی زبان میں کیا تاکہ عوام کی رسائی وہاں تک ہوسکے۔ (مترجم)

خاکوں کو خاص طور سے پیش نظر رکھ کر اس بات کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ جدید ہندستانی کے بہت سے الفاظ اور اصول قواعد سے تعلق رکھنے والی شکلوں کی ابتدا معلوم کرنے کے مشکل مسئلہ میں ہندی کی مختلف بولیوں کے مطالعہ سے بڑی مدد مل سکتی ہے جن میں قدیم اور عبوری دور کی شکلیں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھی گئی ہیں۔ مثلاً جس صورت سے سنسکرت لفظ "بھوَ" "ہونا" میں تبدیل ہو گیا وہ اس وقت فوراً سمجھ میں آجاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بھوجپوری میں "بھا" اور "بھیا" اب تک مستعمل ہے۔

اس لیے وہ لوگ جو ایسے علاقوں میں بستے ہیں جہاں وہ زبانیں بولی جاتی ہیں جن پر ابھی تک تحقیقی کام نہیں ہوا ہے وہ اپنے ضلعوں کی مقامی بولیوں کا مطالعہ کر کے اور انھیں پیش کر کے ہندستانی لسانیات کی بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یہ بولیاں تیزی سے مٹتی جا رہی ہیں اور خطرہ ہے کہ چند سالوں میں یہ بالکل ناپید ہو جائیں گی۔ اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ انھیں مٹنے سے پہلے لکھ لیا جائے اور ان سے جتنی مدد حاصل کی جا سکے حاصل کر لی جائے۔

اس موضوع کے ماتحت میں بعض اور باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہندوستان کے بعض حصوں میں نظر آتی ہیں بعض جگہ کی بولیوں میں مقامی خصوصیات پائی جاتی ہیں جنھیں بولیوں کا فرق نہیں کہا جا سکتا لیکن نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہندی کے لسانی حلقہ میں بعض اضلاع میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کھیتی باڑی کی چیزوں اور خانگی ضروریات کے دوسرے سامان کے نام ایسے ہیں جو

وہیں سے مخصوص ہیں لیکن بولی کے اور حصّے اس خطّے کی عام زبان سے مطابقت رکھتے ہیں، میں اس کی چند مثالیں دوں گا۔ دہلی اور آگرہ کے پڑھے لکھے لوگ گو عموماً بہت اچھی ہندستانی بولتے ہیں لیکن ہمیشہ "اس کا" اور "اس کو" کی جگہ "وِس کا" اور "وِس کو" کہتے ہیں اور نچلے طبقے کے لوگ "جس کے" کی جگہ "جاکے" بولتے ہیں۔

پورنیہ میں اس چھوٹی سی بیل گاڑی کو جسے متوسط طبقہ کے لوگ اور تاجر استعمال کرتے ہیں "ریندھو" کہتے ہیں حالانکہ اس کے لیے ہر جگہ عام طور سے "رتھ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جنگلوں میں چرواہے رات کو آرام کرنے کے لیے جو جھونپڑا بنا لیتے ہیں اسے گنڈک ندی کے ایک طرف "ستھان" کہتے ہیں اور دوسری طرف "اڑاڑ"۔ قریب کے اور علاقوں میں "گھری" اور "سارگھر" کہتے ہیں۔ "گھری" کا لفظ مکان سے ملے ہوئے گائے بیل کے گھر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور ترہت میں اس کو "گوشال" اور پورنیہ میں "گوہال" کہتے ہیں۔

ہندی کا دامن ایسے مقامی الفاظ سے بہت وسیع ہے یہی حال پنجابی اور بنگالی کا ہے اور مجھے شک نہیں کہ مراٹھی اور گجراتی کا بھی۔ ایسی فرہنگوں کی بہت ضرورت ہے جو ان مقامی الفاظ کو جمع کریں۔ لغات کی موجودہ کتابوں میں ان کے شمول سے اضافہ ہو سکتا ہے اور ہندستانی زبانوں کے متعلق ہماری معلومات بہت بڑھ سکتی۔ ان الفاظ کی قدر و قیمت ان کے قدیم ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہت سے نہیں بلکہ تمام سنسکرت الفاظ جو سنسکرت کے مصنفوں نے استعمال کیے ہیں بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہیں اور

اگر الفاظ کے ماخذ معلوم کرنے کا عظیم الشان کام کبھی پورا ہوا اور تاریکی کا وہ پردہ دور کیا گیا جو سنسکرت اور موجودہ زبانوں کے درمیان حائل ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ انھیں دیہاتی بولیوں کی مدد سے ہوگا۔ اس سلسلہ میں ان عجیب و غریب خصوصیات ہی کا مطالعہ ضروری نہیں ہے بلکہ اُن بولیوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو زبان کے معیار سے محض ذرا سا ہٹی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں سے نئے الفاظ اور مفاہیم جمع نہ کیے جاسکیں۔ اکثر تو یہ ہوگا کہ کوئی پیچیدہ لسانی مسئلہ خلاف امید انھیں حقارت سے ٹھکرائے ہوئے الفاظ سے حل ہو جائے کا جنھیں نچلے طبقے کے لوگ بولتے ہیں۔

٭٭٭

باب ششم

نئی بولیوں کے مطالعے اور قلمبند کرنے سے متعلق ہدایات

گذشتہ باب میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں اُن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی نئی زبان کے سیکھنے میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے: اول الفاظ اور لغات کا۔ دوسرے مشتقات اور قواعد کا۔ ہیں قواعد کے مقابلہ میں لغات کو پہلی جگہ اس لیے دیتا ہوں کہ جدید زبانوں میں مشتقات پہلی نظر میں اس طرح موازنہ اور تقابل کے لیے نگاہوں کے سامنے نہیں آتے جس طرح الفاظ۔ مشتقات گو عموماً تمام زبانوں میں ابتداءً یکساں تھے لیکن ہند جرمانی خاندان میں وقت کے گذر جانے کی وجہ سے گھس گئے ہیں، نرم یا سخت ہو گئے ہیں، گر گئے ہیں، منقلب ہو گئے ہیں یا کسی اور صورت سے اس قدر تبدیل ہو گئے ہیں کہ اچھے سے اچھا محقق بھی اُن کے پہچاننے میں دشواریاں محسوس کرتا ہے۔

اس کے برعکس تورانی خاندان میں مشتقات ابتداءً علیحدہ علیحدہ الفاظ ہوتے تھے جو اصل لفظ میں جوڑ دیے جاتے تھے۔ مختلف زبانوں میں ان کا انتخاب مختلف سلسلۂ خیالات کے ماتحت عمل میں آتا تھا مثلاً جمع بنانے کے لیے ان الفاظ کے

مفہوم کا کوئی لفظ جوڑا جا سکتا تھا "مجمع" "گلہ" "جھنڈ" "بہت سے" وغیرہ۔ اگر ایک تورانی زبان میں آدمیوں یعنی آدمی کی جمع بنانے کے لیے "آدمی + جھنڈ" لکھیں گے تو دوسری میں "آدمی + مجمع" اور تیسری میں "آدمی + بہت سے"۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان مختلف شکلوں کی وجہ سے مشتقات میں کوئی ایسی یکسانیت نہیں پیدا ہو سکتی جس کی مدد سے اُن کا مطالعہ کرنے والا ان تین زبانوں کو مخصوص قسموں میں ترتیب دے سکے۔

یہی وجہ ہے کہ تقابلی لسانیات کے لیے سب سے پہلے لغات میں مواد تلاش کرنا چاہیے اگر دو زبانوں میں یہ ثابت کیا جا سکے کہ اُن میں مادّوں (اصل لفظوں) کی کافی تعداد یکساں ہے تو دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق ثابت کرنے کے سلسلے میں ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے اس کے بعد ان کے مشتقات کا تجزیہ شروع ہوگا۔
اگر کسی نا تحقیق شدہ زبان کے مادّوں (اصل لفظوں) کا ایک خاص حصّہ کسی معلوم زبان سے متعلق ثابت کیا جا سکے اور کچھ حصّے کا تعلق کسی اور زبان سے ثابت ہو، اس وقت تاریخی مواد کی عدم موجودگی میں مشتقات ہی کی چھان بین سے تصفیہ کرنے کی امید ہو سکتی ہے کہ اس غیر محقق زبان کو یقینی طور پر مختلف لسانی خاندانوں میں سے کس کے ساتھ گروہ بند کیا جائے۔ اس کی ایک اچھی مثال ماگار زبان ہے (جس کی ایک قواعد میں مرتب کر رہا ہوں) یہ زبان اپنی بنیاد میں تورانی ہے جس کے لغات نیم آریائی ہیں۔

لیکن یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ہم کسی لفظ کو کیسے پہچانیں کہ یہ مادہ ہے یا مشتق؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ کسی دیسی آدمی کی زبان سے

سنی ہوئی اُس کی بولی کو لکھنے کے متعلق چند عملی ہدایات پیش کی جائیں اور مجھے امید ہے کہ یہ اشارے زبان کے سائنٹفک تجزیے کے طویل عمل سے زیادہ مفید ثابت ہوں گے کیونکہ اگر ایک سیاح جو کچھ سُنے اُسے صحت اور جامعیت کے ساتھ نقل کرلے اور تجزیہ کرنے کے لیے اُسے کسی ایسے ماہر لسانیات کے حوالے کردے جو وہاں نہیں گیا ہے تو وہ علم اللسان کی خدمت اس کی بہ نسبت زیادہ کرے گا کہ وہ خود اپنے ناقص اور غلط قیاسات سے اس زبان کے متعلق نتائج اخذ کرے۔

اگر آپ کسی کو کوئی ایسی زبان بولتے سنتے ہیں جسے آپ نہیں جانتے تو اس سلسلہ میں آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ ان آوازوں کی صحیح گرفت کریں جو وہ نکالتا ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات معلوم ہوتی ہے جس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایک وحشی یا غیر متمدن شخص کے مسخ شدہ اور نیم واضح الفاظ کو یا نورانی زبانوں کے نازک نیم موسیقیانہ آہنگ کو صحت کے ساتھ سننا بھی آسان بات نہیں ہے۔ بہت سے ماہرین لسانیات کا بہت سا قیمتی وقت اور بیش بہا علم سیاحوں کے ایسے ہی غلط قلم بند کیے ہوئے الفاظ اور نوٹ کو مطالعہ کی بنیاد بنانے کی وجہ سے ضائع ہوا ہے کیونکہ انھوں نے جو لفظ سنے وہ صحیح تلفظ کے ساتھ قلم بند نہیں کیے اُن کے کانوں کو اور مانوس بنانے کے لیے اور تعلیم کی ضرورت تھی۔

ہندوستان میں یہ احتیاط اور زیادہ ضروری ہے کیونکہ ہند جرمانی خاندان کی جو بولیاں یہاں بولی جاتی ہیں وہ اس قدر عام ہیں اور تمام بڑے سیاسی اور تجارتی مرکزوں میں اس کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں کہ کسی سیاح کا ان کو قلم بند کرنا ضروری نہیں۔ وہ جا بجا قلمی اور مطبوعہ کتابیں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں اس لیے

محققوں کا صرف سیاحوں کی یادداشتوں پر بھروسہ کرنا غلط ہوگا۔

ہاں ہمالہ میں، آسام، کاچھار اور چٹاگانگ کی سرحدوں پر، چھوٹا ناگ پور اور گونڈوانا میں کافی کام کرنے کو ہے، ان جگہوں کی زبانیں چند کو چھوڑ کر باقی سب تورانی ہیں اور تحریر میں نہیں آئیں اس لیے ناواقف کے لیے اس میں بہت سے دام فریب ہیں۔

ایسی حالت میں اس بات سے بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوگا کہ ایک دیہاتی کو کسی ایسے شخص سے بات چیت کرنے پر آمادہ کیا جائے جو اس کی بولی میں بات چیت کر سکتا ہو، یہ بھی کوشش کی جائے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ آہستہ آہستہ باتیں کرے اس گفتگو کو بہ غور سُن کر کان اس بولی کے لب ولہجہ اور انداز سے مانوس ہو جاتا ہے اور بار بار آنے والے الفاظ کو سمجھ لیتا اور یاد کر لیتا ہے گفتگو کے دوران میں یہ الفاظ لکھ لینے چاہئیں اور آوازوں کے لحاظ سے لکھنا چاہیئے۔ فرانسیسی نظامِ حروفِ علت تورانی حروف علت کے ظاہر کرنے کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہوگا BLEU میں EU کی AEIL میں AEI کی FEUILTE میں EUI کی CAEUR میں AEU کی آوازیں اکثر ملیں گی۔ اسی طرح لیپچا میں BLEU یعنی "چھوٹی پہاڑی" فرانسیسی لفظ BLEU یعنی "نیلا" سے بالکل ہم تلفظ ہے۔

جب ایک دیہاتی کی بات سنتے سنتے آپ کے کان صحیح تلفظ کی گرفت کرنا سیکھ جائیں تو اس سے ان لفظوں کے معنی پوچھئے جو آپ نے لکھ لیے ہیں، پوچھتے ہوئے آپ خود انھیں اپنی زبان سے ادا کیجئے غالباً جب آپ کو اطمینان ہو چکا ہوگا کہ آپ کا تلفظ صحیح ہے وہ آپ کے تلفظ میں اصلاح کرے گا اس کا سبب یہ ہے کہ تمام تورانی زبانیں آوازوں کے انمیل کا ایک نازک اور پیچیدہ نظام رکھتی ہیں جسے ایک غیر ملکی آسانی سے

نہیں سیکھ سکتا۔ زبان کی اس صوتی خصوصیت اور لہجہ کا تذکرہ SUMMERS کی کتاب CHIVESE GRAMMAR میں بڑی خوبی سے ملتا ہے جہاں اسے نہایت واضح اور سادہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔

انگریزی میں بولنے والے کے جذبات کے لحاظ سے ایک ہی لفظ مختلف لہجوں میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ بیکسا چینی زبانوں میں اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی الفاظ کا لہجہ معین اور لفظ ہی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً کچھ الفاظ ایسے ہیں جو ہمیشہ تعجب کے انداز میں ادا کیے جائیں گے جیسے انگریزی الفاظ "HA" یا "HOLLOA" دوسرے قسم کے الفاظ وہ ہیں جن کا لہجہ سیدھا سادا ہوتا ہے جیسا کہ ہم انگریزی کی عام جذباتی گفتگو میں پاتے ہیں۔ لہجہ کی تیسری شکل ایک اوپر اٹھنے والا انداز ہے جیسے انگریزی میں سوالیہ جملے ہوتے ہیں "WHO ARE YOU ?" یا "WELL, WHAT THEN ?" چوتھا نیچے اترنے والا لہجہ ہے جیسا کہ کسی کو اپنے پاس سے ہٹانے میں استعمال ہوگا جیسے ہندستانی میں "چلے جاؤ" یا مایوسی کا لہجہ جیسے "NO! ALL IS LOST"۔ پانچویں شکل چانک رک جانے والے لہجہ کی ہے جیسے "NO! CERTAINLY NOT!"۔

ہم جیسے لوگوں کے لیے، جو لہجہ اور لفظوں پر زور دینے کو جذبات کے اظہار کے موقع پر ضروری سمجھتے رہے ہیں اور جسے ہم اپنی خواہش کے مطابق جب اور جہاں چاہیں استعمال کر سکتے ہیں، اس نظام الفاظ اور آواز کو سمجھنا بہت مشکل ہے جس میں ہر لفظ کا اپنا مقررہ لہجہ ہے چاہے اس سے جس جذبے کا اظہار بھی مقصود ہو۔ اس بات کا پتہ کسی بھوٹانی یا چینی سے پانچ منٹ گفتگو کرنے کے بعد چل جائے گا۔ بہتوں کا لفظ ذرا انداز بھی لہجہ کے انھیں مختلف درجوں کی وجہ سے قائم ہے۔ اس بات کو

ذہن میں رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ جس ملکی آدمی سے آپ باتیں کر رہے ہوں وہ اس وقت تک آپ کے لہجے اور تلفظ کو صحیح کرتا رہے گا جب تک آپ اُسے صحیح طور پر ادا نہ کرنے لگیں اور اس بات کا علم کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے ایک سیکھنے والے کو مایوسی سے متعجب ہو کر رہ جانے اور اپنی کوشش ترک کر دینے سے باز رکھ سکتا ہے۔

جب ابتدائی دشواریوں پر قابو حاصل ہو جائے تو پہلے ایک سے دس تک اور پھر گیارہ ۱۱ سے بیس ۲۰ تک کے اعداد معلوم کیجیے اور یہ بھی معلوم کیجیے کہ مرکب اعداد مثلاً اکیس ۲۱ بائیس ۲۲ وغیرہ کس طرح بنتے ہیں اُس وقت مرکب اعداد کی بناوٹ میں جو بے ترتیبیاں دکھائی دیں انھیں کو قلم بند کیجیے جیسے ہندوستان میں باون ترپن وغیرہ اعداد بنانے کے طریقے بہت مختلف ہیں بعض زبانوں میں صرف ایک سے پانچ تک الگ الگ معین الفاظ ہیں اور چھ سے دس تک یوں بناتے ہیں کہ پانچ + ایک" "پانچ + دو" وغیرہ مثلاً کمبوجن زبان میں اعداد یوں ہیں :-

ایک = MOE　　دو = PIR　　تین = BAI　　چار = BUAN

پانچ = PRAM　　چھ = PRAM-MOE　　سات = PRAM-PIR

آٹھ = PRAM-BAI　　نو = PRAM-BUAN　　دس = DAY

بعض زبانوں میں بیس کو "چار پانچ" (یعنی چار دفعہ پانچ) سے ظاہر کرتے ہیں۔ بعض جگہ دو دس سے بڑے اعداد کے بنانے میں اور بے قاعدگیاں ہیں یہی بات فرانسیسی زبان میں بھی ملتی ہے (یہاں سے چند مثالیں چھوڑ دی گئی ہیں (مترجم)

اس کے بعد ضمیروں یعنی "میں" "تو" "وہ" وغیرہ اور اُن کی مختلف حالتوں "میرا" "مجھ کو" وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیئے۔ ان کی طرف شروع ہی میں

متوجہ ہونا ضروری ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے آپ اس سے زیادہ حاصل کرکے قلم بند کرنے سے معذور رہ جائیں تو بھی آپ کے پاس اُس زبان کا کم سے کم وہ حصّہ رہے گا جو دوسری زبانوں سے مشابہت اور تعلقات کو سب سے زیادہ نمایاں کرے گا۔

جب اعداد و ضمائر معلوم کرلیجیے، عام اشیاء میں سے جن کے نام کا علم آپ حاصل کرسکتے ہوں کیجیے، ان کے علاوہ رشتوں کے نام، اعضائے جسم کے نام بھی معلوم کیجیے اور اسم کے لغات میں اضافہ کیجیے۔ یہ کام مشکل نہ ہوگا فعل کے سلسلے میں البتہ یہ دشواری ہے کہ ہماری کتب لغات میں ہند جرمانی افعال عام طور سے مصادر کی شکل میں ملتے ہیں مثلاً ہمیں "مرنا" ملے گا "مر" نہیں "گرفتن" ہوگا "گیر" نہیں لیکن غیر متمدن لوگوں کو جن کی زبانیں لکھی ہوئی اور ترقی یافتہ نہیں ہیں قواعد کے یہ فرق معلوم نہیں ہیں اور ان سے اس کے متعلق کوئی سوال پوچھنا بیکار ہوگا۔ اگر آپ ہندستانی کا بہت ہی عام صیغہ فعل امر "بولو" استعمال کریں اور ایک کول سے اس کا مترادف پوچھیں تو وہ فوراً بتادے گا "ABBENKAKAUI" یا "KAUEEBEN" اس سے لفظ "KAUITEA" نکالنا جس کے معنی "بولنا" یا یہ سمجھنا کہ "KAJEE" اصل لفظ ہے جس سے افعال کی ساری شکلیں نکلی ہیں مشکل ہے کسی کول کو یہ سمجھانا کہ آپ اس سے کیا جاننا چاہتے ہیں اُسے عالم حیرت میں ڈال دے گا سب سے اچھا کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے بہت سے جملے جمع کرلیجیے جن میں یہ فعل مختلف شکلوں میں واقع ہوتا ہے اور پھر ان جملوں کا تجزیہ کیجیے تو جو نتیجہ آپ نکالنا چاہتے ہیں وہ نکل آئے گا جملے بنانے کا جو طریقہ ہے وہ بھی اسی طرح آسانی

سے سمجھ میں آجائے گا۔ اور اس سے مختلف شکلوں سے مادہ نکال لینے کی آسان صورت نکل آئے گی اور انھیں جملوں سے تقریباً تمام شکلیں اور الفاظ کی مختلف نوعیتیں مثلاً اسم، صفت، فعل، حرف وغیرہ حاصل ہو جائیں گی۔

تورانی زبانوں میں جو تغیرات آوازوں میں تال میل پیدا کرنے کی وجہ سے ہوتے ہیں وہ تعداد میں بہت زیادہ اور حیرت میں ڈال دینے والے ہیں۔ خاص اصول یہ ہے کہ لفظ میں ہر جگہ وہی حرفِ علت آتا ہے جو پہلا ہوتا ہے مثلاً ترکی میں لفظ کا جزو "ان لا NU" جب ایسے لفظ میں ملایا جاتا ہے جس میں حرفِ علت "ا" ہے تو وہ "INUI" ہو جاتا ہے، جیسے "BIRINJI" (اول) ہنگری زبان میں حروفِ علت دو قسموں میں منقسم ہوتے ہیں اور دونوں قسم کے حروفِ علت ایک ہی لفظ میں نہیں آسکتے تورانی خاندان کی زبانوں میں خاص طور سے اسم حالیہ اور افعال صفاتی (PORTICIPLES) بہت ہیں اور انھی کے ذریعہ سے بہت سے جملے بن جاتے ہیں جو دوسری زبانوں میں اضافی یا دوسری قسم کی ضمیروں سے ظاہر کیے جاتے۔

جہاں تک آریائی خاندان کی زبانوں کا تعلق ہے اُن کے متعلق بس اتنا معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ہندستانی گروپ کی چھ یا سات زبانوں میں سے کس سے متعلق کی جاسکتی ہیں۔ اس خاص زبان کی ایک قواعد سے کہ اس زبان کے کلاسکی معیار سے جو اختلافات نظر آئیں انھیں دیکھ لینا آسان ہوگا۔ اور انھیں اختلافات ہی کی تحقیقات باقی رہ گئی ہے۔[1]

ایک زبان کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے اور اس کو ضبطِ تحریر

---

[1] اس سلسلہ میں اس کتاب کا پانچواں باب "بولیاں" بھی دیکھ لینا چاہیے۔ (بیمز)

میں لانے کے عمل کو مکمل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ٹھیک جگہ بھی جانی جائے جہاں وہ بولی جاتی ہے اور علاقہ بھی جس میں وہ پھیلی ہوئی ہے۔ اگر ہو سکے تو ایسی باتیں معلوم کی جائیں کہ اس کا بولنے والا قبیلہ کہاں سے آیا اور کیا قریب کے قبائل سے اس کا کوئی تعلق تھا؟

- تلفظ اور لفظوں پر زور دینے کے عام انداز کا مشاہدہ کرنا بھی ضروری ہے کیا یہ ہندستانی کی طرح خفیف، سخت اور پھیکا ہے یا پنجابی کی طرح دھیما، بڑبڑاہٹ پیدا کرنے والا اور کھینچ کر ادا کیا جانے والا یا بنگالی کی طرح واضح، جبڑے اور رخسار کے اعصاب پر زور دے کر ادا کیا جانے والا؟ تلفظ کی خاص عادت جو کسی قوم میں پائی جاتی ہے وہی اکثر بولیوں کے فرق کا سبب بن جاتی ہے مثلاً اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ پنجابی "کہڈا"، "کھنڈا"، اور "کہنا" استعمال کرتا ہے جس جگہ ہندستانی "کہتا" استعمال کرے گا اور بنگالی "کہی نے چھن" (تلفظ اور لہجہ کے متعلق بیمز کے خیالات بہت واضح نہیں ہیں خصوصیات کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ بہت موزوں نہیں معلوم ہوتے۔ مترجم)

عام طور سے ہندوستان میں لغات جمع کرنے کے لیے ایک ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے اور عموماً یہ ترجمان ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو زبان زیر بحث کے علاوہ ہندستانی یا بنگالی جانتا ہے جب آپ ایک ترجمان کی وساطت سے کسی مقامی آدمی سے اپنا جملہ کہتے ہیں تو یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندستانی جملوں کی ساخت کے لحاظ سے الفاظ کی ترتیب میں بلکہ تھوڑا بہت معنی میں بھی تغیر ہوگا۔ یہ خاص صورت جملہ میں الفاظ کی ترتیب کے سلسلہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ہندستانی ترتیب انگریزی

اور دوسری ہند جرمانی زبانوں کی تقریباً بالکل اُلٹی ہوتی ہے اور بہت مصنوعی بھی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا اکثر ہوگا کہ جس زبان کا آپ مطالعہ کر رہے ہیں اُس کا کوئی جملہ ترتیب الفاظ کے لحاظ سے آپ کے ہندستانی جملہ سے ملتا ہوا ہو، ہوسکتا ہے کہ اس کی ترتیب وہ نہ ہو جو وہ غیر تعلیم یافتہ دیہاتی چاہتا ہے بلکہ ہندستانی کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے بدل گئی ہو۔ اس غلطی کا پتہ چلانے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہی جملہ کو یا ویسے ہی جملوں کو بار بار دہرایا جائے اور اُس وقت تک چین نہ لیا جائے جب تک کہ صحیح ترتیب الفاظ نہ معلوم ہو جائے یعنی وہ ترتیب جس میں اُس زبان کا بولنے والا دیہاتی اُسے استعمال کرے گا۔

خاتمہ میں ہندستانی الفاظ کے رومن رسم خط میں لکھنے کے متعلق بھی کچھ لکھنا مناسب ہوگا جو سر ولیم جونس[1] نے اختیار کیا تھا اور جس پر مشہور محقق پروفیسر ایچ۔ ایچ ولسن[2] نے اضافہ کیا تھا۔ عام طور سے مستعمل ہے میں بھی اسی کی سفارش کرتا ہوں۔ تورانی خاندان کی زبانوں کے لکھنے کی کوشش بے سود ہوگی کیونکہ مجھے کسی اچھے طریقے کا علم نہیں ہے۔ لپ سئیس کا معیاری رسم خط پیچیدہ بھی ہے اور حروف علت کی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے ناکافی بھی۔ بہترین صورت یہ ہے کہ آپ خود کوئی طریقہ طے کر لیجیے اور اپنی یادداشت کے شروع میں اُسے لکھ دیجیے اور مقرر کی ہوئی

---

[1] ایک انگریز فاضل جس نے بہت سے علمی کام کیے ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال بنیاد ڈالی۔ اس نے سنسکرت کا مطالعہ کر کے ۱۷۸۶ء میں اپنا انقلاب آفریں خیال پیش کیا کہ یونانی، لاطینی، سنسکرت وغیرہ میں بنیادی مماثلت پائی جاتی ہے۔ وہ ہندستان میں ممتاز عہدوں پر رہا ۱۷۹۴ء میں اڑتالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ (مترجم)

[2] ولسن آکسفورڈ یونیورسٹی میں سنسکرت کا بوڈلن پروفیسر تھا اس نے سنسکرت لغت اور کئی دوسری اہم کتابیں مرتب کی ہیں۔ (مترجم)

آوازوں کو انگریزی یا فرانسیسی یا کسی اور عام طور پر جانی جانے والی زبان کی آوازوں کے مطابق کر لیجیے پھر اپنی ساری تحقیقات میں اُسی پر عمل کیجیے ورنہ بڑی پیچیدگیاں اور غلطیاں ظاہر ہوں گی۔

پہلے[1] میرا ارادہ تھا کہ زبان کے تجزیہ پر بھی کچھ خیالات ظاہر کردوں گا یعنی وہ طریقۂ عمل بتاؤں گا جس سے زبان کے مختلف چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں اور اُن کی جانچ ہو سکتی ہے۔ ہم خاندان بولیوں سے ان کا مقابلہ اس نظر سے کیا جا سکتا ہے کہ عام لسانی دائرے میں اس زبان کی جگہ معین کی جا سکے لیکن جب میں نے دوبارہ غور کیا تو اُسے چھوڑ دینا ہی مناسب معلوم ہوا کیونکہ اس طرح میں اُن تفصیلات میں پہونچ جاؤں گا۔ جن کا اس مختصر کتاب میں پیش کرنا مناسب نہیں۔ اس کے علاوہ یہ عمل ایسا ہے جس کی طرف ایک عام مطالعہ کرنے والا علم اللسان کی وسیع معلومات کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ایک سیاح یا زبانوں کا عام مشاہدہ کرنے والے کا اتنا ہی کام ہے کہ جو کچھ وہ دیکھے یا سُنے زیادہ تر اُسی کو قلم بند کر لے۔ لسانیاتی دار التحقیق کے ٹھکانے والے کام عام لوگوں کے لیے کچھ زیادہ دلچسپی کا سامان بھی نہیں رکھتے۔

---

[1] دوسرے اڈیشن میں یہ پیراگراف نہیں ہے بلکہ اس کو نکال کر اور اس کے بدلے دو پیراگراف بڑھائے گئے ہیں جو پہلے اڈیشن میں تھے۔ میں نے ترجمہ میں شامل کر لیا ہے۔ (مترجم)

ضمیمہ جات[1]

ضمیمہ (الف):-

ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں سے ایک سے دس تک کے اعداد تقابل کے لیے دیے گئے ہیں۔ اعداد کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ ان میں بہت کم تبدیلی ہوتی ہے۔

ضمیمہ (ب):-

چند اہم تورانی بولیوں سے ضمائر دیے گئے ہیں تاکہ ان کا تقابلی مطالعہ ہو سکے۔ ضمائر کا انتخاب بھی اسی لیے کیا گیا کہ ان میں بھی بہت کم تبدیلی ہوتی ہے۔

ضمیمہ (ج):-

یہ ضمیمہ پہلے اڈیشن میں نہیں تھا۔ اس میں آسام کی زبانوں کے متعلق سرکاری ذرائع سے جو اطلاعات حاصل ہوئی ہیں ان کے خلاصے دیے گئے ہیں

اضافہ:-

یہ بھی دوسرے اڈیشن میں ہے پہلے میں نہیں اس میں دراوڑی زبانیں بولنے والوں کی تعداد دی گئی ہے جو موجودہ حالات میں غلط ہو چکی ہے۔

---

[1] طوالت کے خیال سے، ضمیمے نہیں دیے گئے صرف ان کے موضوع کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ (مترجم)

موجودہ ہندوستان
اور
پاکستان

نیپال
بھوٹان
آسام
بہار
منی پور
مشرقی پاکستان
بنگال
تریپورہ
برما
اڑیسہ
کلکتہ
خلیج بنگال
جزائر انڈمان

پنجاب
مدراس

ہندستانی لسانیات کا خاکہ

"جان بیمز کا ایک مشہور پمفلٹ ہے جس کا نام ہے "این آؤٹ لائن آف انڈین فیلالوجی" یہ اسی رسالہ کا ترجمہ ہے جسے پروفیسر سید احتشام حسین نے کیا ہے، یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے جس میں ہندستانی زبانوں کی تقسیم ان کے مدارج ارتقا اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور بحالات موجودہ جبکہ زبان کے مسئلہ نے سیاسی اہمیت اختیار کر لی ہے اس کا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں۔

ترجمہ تو خیر احتشام صاحب کو اچھا کرنا ہی تھا لیکن انہوں نے قطع نظر خود ۷۶ صفحات کا مقدمہ لکھ کر انھوں نے کتاب کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ اس موضوع پر اس سے قبل بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو تحقیقی و تاریخی معلومات اس کتاب سے حاصل ہو سکتی ہیں، وہ دوسری کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔" نگار۔ مئی [illegible]

"..... لائق مترجم کا مقدمہ اصل کتاب سے زیادہ کارآمد ہے۔ اس کے بغیر یہ ترجمہ ناقص رہتا۔ زبان کا مسئلہ ہر ملک و قوم میں خالص لسانی حیثیت رکھتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہندستان میں اس کو قومی اور سیاسی بنا دیا گیا ہے۔ اس کتاب سے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مترجم نے خاص طور سے اس کو مقدمہ میں پیش نظر رکھا ہے۔" ..... کتاب ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے۔" معارف نمبر ۱۔ جلد ۶۲

قیمت دو روپے

دانش محل

امین الدولہ پارک، لکھنؤ